بیکراں

جگن ناتھ آزاد

مکتبۂ شاہراہ ۰ دہلی

پہلی بار نومبر ۱۹۴۹ء

دوسری بار جولائی ۱۹۵۴ء

قیمت :- چار روپے آٹھ آنے

پرنٹر :- محبوب المطابع برقی پریس اردو بازار دہلی

پبلشر :- مکتبۂ شاہراہ اردو بازار دہلی

ترتیب

پیش لفظ

سچے معنوں میں بحیثیتِ شاعر مشہور ہونا ہر دور میں ایک مشکل امر رہا ہے۔ فصیح اور بے عیب کہنے والوں کی اکثریت بھی مشہور نہیں ہو سکی۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ شروع میں تو نام اُچھلا اور نگاہیں اُٹھیں لیکن شہرت دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ ڈاکٹر جانسن کا قول ہے کہ کامیابی ایک عام بدنصیبی ہے۔ لیکن کم عمری میں کامیابی نصیب ہونا سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔ بہرحال شاعری میں ایسی کامیابی جو ثابت قدم بھی ہو اور ترقی پذیر

بھی، کم یاب ہے۔ پھر جب ہم دَورِ حاضر کی بلند پایہ اُردو شاعری کے نمونوں اور مطالبوں پر نظر ڈالتے ہیں تو کسی شاعر کا اپنے لئے خاص جگہ پیدا کرنا ہر لحاظ سے قابلِ توجہ کارنامہ ماننا پڑتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے دَورِ حاضر کی اُردو شاعری میں اپنے لئے ایک خاص جگہ پیدا کرلی ہے۔ اس کا ہر صاحبِ ذوق کو خوشی اور بے تکلّف اعتراف ہوگا۔

فرانس کے سب سے بڑے نقّاد سین بیؤ نے کہا ہے کہ جب میں کوئی کتاب پڑھتا ہوں تو پہلے اس کتاب کے ادبی و فنّی و فکری محاسن پر نظر نہیں ڈالتا بلکہ یہ دیکھتا ہوں کہ اس کتاب کا مصنّف کتنا اچھا آدمی ہے۔ نیکی و شرافت جو زندگی کے سب سے بڑے جوہر ہیں ادب و شاعری کے بھی سب سے قیمتی جوہر و عناصر ہیں۔ حقیقی ادبی تخلیق حقیقت میں ایک اخلاقی عمل ہے۔ آزاد کی شاعری میں جو صفت سب سے زیادہ جاذبِ نظر اور سب سے زیادہ دل کش ہے وُہ آزاد کی وہ نیکی اور انسانیت ہے جس میں تصنّع کا نام نہیں۔ زندگی کا یہ خلوص ہی آزاد کی شاعری کا محرک اور خلّاق ہے۔ آزاد کے خیالات اور ان کے لہجے میں سچّی انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اور ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔

آزاد بڑے باپ کے بیٹے ہیں - ان کے والد تلوک چند محروم جتنے اچھے اور پختہ کار شاعر ہیں اُتنے ہی اچھے اور قابلِ احترام انسان بھی ہیں آزاد نے بلند سے بلند جو مغربی و مشرقی تعلیم و تہذیب اس زمانے میں حاصل کی جا سکتی ہے اُسے کامل طور پر حاصل کیا ہے - لیکن ان کی تربیت میں غالباً کیا یقیناً جس چیز نے سب سے بڑا حصّہ لیا ہے وہ حضرت محروم کی "نظر" نے اور اُن کے سنجیدہ کردار کی خاموش فضا اور ماحول نے - ایسے غیر شعوری اثرات زندگی کو سنوار دیتے ہیں - آزاد بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں لیکن اُن کی بلند تعلیم اس مرکزی اثر کے سانچے میں ڈھلی ہے جس کا ذکر میں نے کیا ہے - ایسے جوانِ صالح اس دَور کے لئے اور ہر دَور کے لئے مایۂ ناز ہیں - سمجھ میں نہیں آتا کہ آزاد کی انسانیت پر رشک کیا جائے یا قابلیت پر یا اُن کی اس شاعری پر جو نہ جانے کیوں رہ رہ کر دلوں کو کھینچتی ہے -

آزاد کی غزلیات، رباعیات، قطعات اور نظمیات کو خواہ سرسری طور پر کوئی پڑھے خواہ غائر طور پر، یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ آزاد کی آواز بیک وقت نرم، متوازن اور مردانہ وار ہے - لہجہ بیک وقت سنجیدہ و حسّاس ہے - خیالات، جذبات، قلب و نظر اس تربیت و تہذیب کا پتہ دیتے ہیں جس کی جتنی بھی قدر

کی جائے کم ہے۔ الفاظ و بیان میں قابلِ رشک شستگی ہے۔ ان کے ہر شعر کے آئینے میں ان کا کردار جھلک رہا ہے اور ان کے سجل دل و دماغ بھی۔ سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ اُن کا کلام برابر ترقّی کرتا ہُوا نظر آتا ہے۔ سلمیّت تو اُن کے کلام میں کہیں ہے ہی نہیں۔ ایک بڑھتی ہوئی گہرائی جس میں برابر تہیں پڑتی جا رہی ہیں، ایک بلندی جو نئی منزلیں تلاش کر لیتی ہے، ایک ایسی تنقیدِ حیات جو سادہ و پُرکار ہے، ایک ایسا اندازِ بیان جو چونکہ بے تصنّع ہے اس لئے بے حد دلکش ہے، زندگی سے، انسانیت سے، کائنات سے فطری اور پُرخلوص لگاؤ، ایک چوٹ کھایا ہُوا دل جس نے اپنی چوٹ کو قبول کر لیا ہے۔ یہ ہیں وہ خصوصیات جو آزاد کی شاعری کو امتیازی رنگ عطا کرتی ہیں۔

تقسیمِ ہندستان نے حضرتِ محروم سے ضعیفی میں اور آزاد سے جوانی میں اُن کا محبوب خطۂ وطن مغربی پنجاب چھڑوا دیا۔ اس سانحے نے آزاد کی شاعری میں ایک نئی کسک اور نیا چٹیلا پن پیدا کر دیا ہے۔ چھُوٹے ہُوئے وطن کی محبّت نے اُن کی معصوم و پُرخلوص ہنسی میں آنسوؤں کی چاشنی اور اُن کے آنسوؤں میں تبسّم کی جھلک پیدا کر دی ہے۔ اس سے اُن کا کلام اور بھی چمک اُٹھا ہے۔ دِلّی اُجڑنے کے بعد جو شعرائے دِلّی لکھنؤ آ بسے تھے یا لکھنؤ اُجڑنے کے بعد

جن شاعروں کو رامپور و حیدرآباد کا منہ دیکھنا پڑا، اُن کے کلام میں اپنی جنم بھوم کے لئے اتنے چٹیلے اشعار نہیں ملتے جتنے آزاد کے کلام میں پنجاب کی یاد سے پیدا ہوئے اشعار ملتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جس خلوص سے آزاد نے نئے اور اجنبی ماحول کو اپنایا ہے وہ بھی قابلِ صد ہزار تحسین ہے۔

سوچا تو میں نے یہ تھا کہ کلامِ آزاد سے جستہ جستہ نمونے پیش کرکے ہر ٹکڑے پر کسی قدر تفصیل سے اظہارِ خیال کروں اور اس طرح اپنے ذوقِ سخن پر احسان کروں۔ لیکن اتنی فرصت نہیں نکال سکا۔ پھر بھی آزاد کے مجموعۂ کلام کے ساتھ یہ پیش لفظ چھپ رہا ہے۔ اس لئے شائقین اس مختصر عبارت کو پڑھ کر جب اس مجموعے کے اوراق پلٹیں گے تو آزاد کے کلام کی چمک دمک خود نگاہوں کے سامنے آجائے گی۔ مشک آنست کہ.......

ایک آدھ بات اور کہہ لینے دیجئے۔ آزاد کے تخیّل اور فن اور اُن کی ذہنی نشو و نمو کو سیراب و شاداب کرنے والے ایک طرف بلند ترین مغربی ادب اور علوم ہیں اور دوسری طرف رچے ہوئے فارسی ادب اور اردو ادب کے کارنامے ہیں۔ علم و ادب کی دُنیا کے وُہ بہت بڑے سرمایہ دار ہیں۔ ان کی ہونہار اور سلامت رو شاعری کے لئے ابھی بہت بڑے امکانات ہیں

ان کی شاعری کا مستقبل تابناک ہے اور یہ مجموعہ مہرِ نیم روز کے طلوع کا پتہ دیتا ہے۔ ہمیں آزاد کی شاعری سے ابھی بہت اُمیدیں ہیں۔ آزاد کی شاعری کی جڑیں گہری ہیں۔ اُٹھان نہایت شاندار ہے اور اس کی تکمیل اور بھی زیادہ شاندار ہوگی۔ یہ شاعری کتابی شاعری نہیں ہے بلکہ زندگی کی آواز ہے، ایک چوٹ کھائے ہوئے مگر سوچنے والے دل کی پکار ہے اور ایک ایسے شاعر کا کلام ہے جسے شعر کہنا آتا ہے۔

الہ آباد
۱۱ ستمبر ۱۹۴۹ء

فراق گورکھپوری

طبعِ ثانی

"بیکراں" کا پہلا ایڈیشن نومبر ۱۹۴۹ء میں شائع ہُوا اور ایک برس سے کم مدت میں ختم ہو گیا۔ اس دور میں نظم کی کتاب کا اس تیزی سے فروخت ہو جانا میرے لئے ہر اعتبار سے حوصلہ افزا ہے۔ اُردو سے محبت رکھنے والوں کی اس توجہ کا ممنون ہوں۔

پہلا ایڈیشن اس قدر رواروی کے عالم میں مرتب ہُوا تھا کہ بعض پسندیدہ نظمیں اور غزلیں اس میں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں۔ سیاسی انتشار اور ذہنی پریشانی کے دوران میں تمام منظومات کو اِدھر اُدھر سے جمع کرنا میرے لئے آسان نہ تھا۔ اس لئے جن نظموں اور غزلوں وغیرہ کی تلاش میں دقت پیش آئی انھیں نظر انداز کر دیا گیا

جب "ستاروں سے ذرّوں تک" زیرِ ترتیب تھی تو گم شدہ منظومات میں سے بعض دستیاب ہوئیں لیکن انھیں اس مجموعے میں شامل کرنا میں نے مناسب نہ سمجھا کیونکہ "بیکراں" سے پہلے کی کہی ہوئی نظموں کی صحیح جگہ "بیکراں" ہی تھی نہ کہ اس کے بعد کا مجموعۂ کلام۔ "بیکراں" ۱۹۴۹ء کی ابتدا تک کے کلام پر مشتمل ہے۔ اور "ستاروں

سے دورِ دوراں تک" اُس وقت سے ۱۹۵۰ء کی ابتدا تک کے کلام پر۔ اس التزام کو برقرار رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ یہ نظمیں اور غزلیں "بیکراں" کے دُوسرے ایڈیشن تک اُٹھا رکھتا۔ مجھے خوشی ہے کہ آج مجھے اپنی خواہش کے مطابق یہ نئی نظمیں اہلِ ہند و پاکستان کے سامنے پیش کرنے کا موقع ملا ہے۔

"بیکراں" کے پہلے ایڈیشن کی تمام نظمیں، غزلیں، قطعات و رباعیات اس ایڈیشن میں موجود ہیں۔ شاید ہی میں نے کوئی شعر اس میں سے حذف کیا ہو۔ نئی نظموں اور غزلوں کے اضافے کے باعث کتاب کی ضخامت پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ اب اس اطمینان کے ساتھ کہ نقشِ ثانی نقشِ اوّل سے بہتر ہی نہیں بلکہ کسی حد تک زیادہ مکمل بھی ہے، میں "بیکراں" کا دُوسرا ایڈیشن اہلِ نظر کی خدمت میں پیش کرتا ہوں ؏

بگیر این ہمہ سرمایۂ بہار از من

دہلی
۷ مارچ ۱۹۵۱ء

آزاد

سحر در شاخسار بوستانے
چہ خوش می گفت مرغ نغمہ خوانے

بر آور ہر چہ اندر سینہ داری
سرودے ، نالۂ ، آہے ، فغانے

اقبال
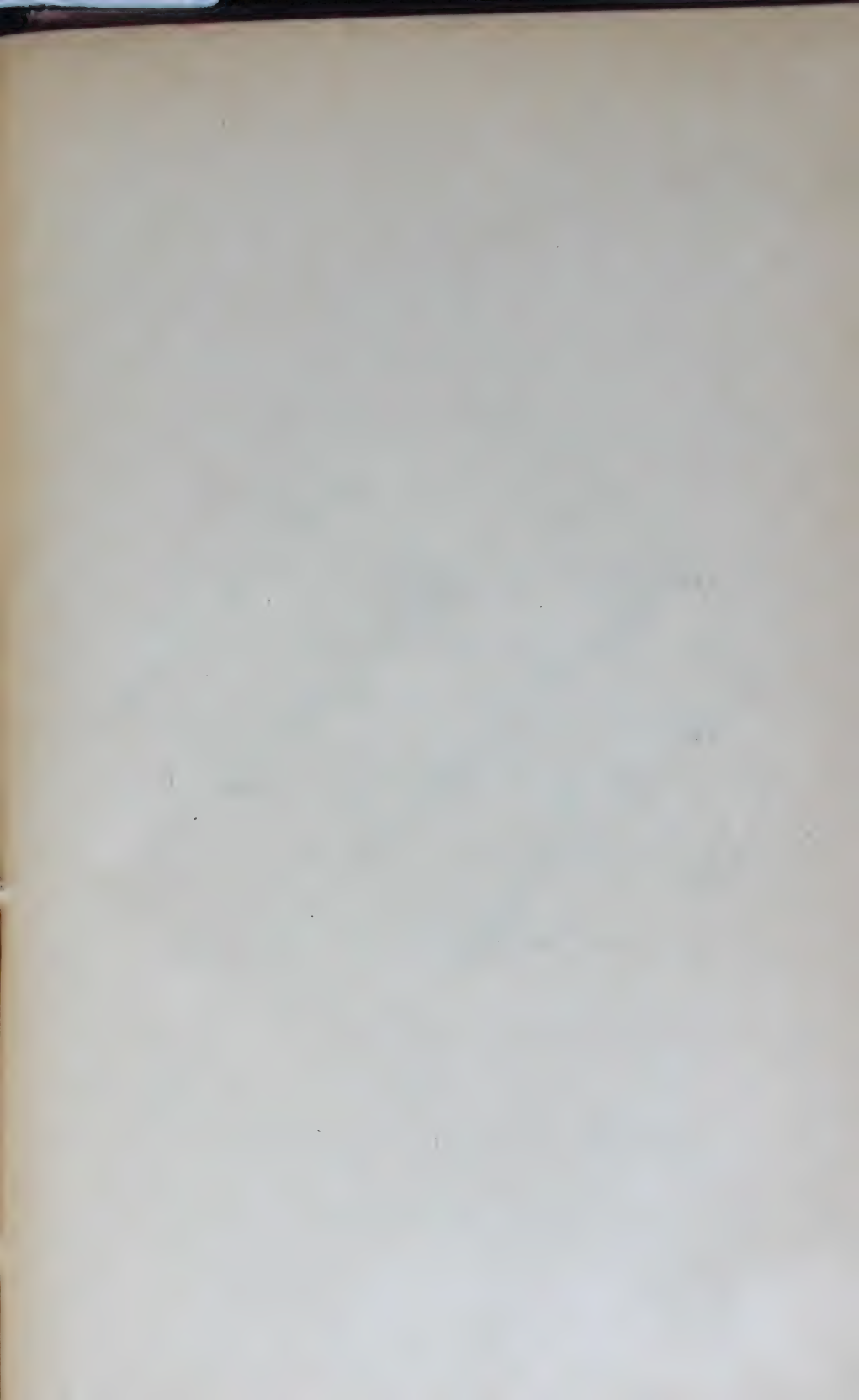
۱۵ اگست ۱۹۴۷ء

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری
ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گزری
بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا
بتا اے پیرِ مے خانہ یہ میخانوں پہ کیا گزری
فضا میں ہر طرف کیوں دھجیاں آوارہ ہیں اُن کی
جنونِ سرفروشی تیرے افسانوں پہ کیا گزری

وصالِ شمع کی حسرت میں سب بیتاب پھرتے تھے
میں کیا جانوں حضورِ شمع پروانوں پہ کیا گزری

کہو دیر و حرم والو! یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری

نشانِ برگِ گُل تک بھی نظر آتا نہیں ہم کو
سمجھ میں کچھ نہیں آتا گلستانوں پہ کیا گزری

جہاں نورِ سحر کے بھی قدم جمنے نہ پاتے تھے
بتائے کون آخر اُن شبستانوں پہ کیا گزری

وہ رنگ و نُور سے بھرپُور بستانوں پہ کیا بیتی
شباب و شعر سے معمُور کاشانوں پہ کیا گزری

ابھی تو چشمِ عبرت وقت کی رفتار دیکھے گی
ابھی یہ کس طرح کہہ دیں ستم رانوں پہ کیا گزری

نہ پُوچھ آزاد اپنوں اور بے گانوں کا افسانہ
ہُوا تھا کیا یہ اپنوں کو یہ بے گانوں پہ کیا گُزری

قطعہ

وطن کی اے مقدس سرزمیں احساس بھی کچھ ہے
کہ تجھ سے چھُوٹ کے تیرے سوختہ جانوں پہ کیا گزری
تجھے اے کاش دہلی اور شملہ یہ بتا سکتے
میانوالی کے صحرا تیرے دیوانوں پہ کیا گزری

غزل

اے دوست! تری یاد نے بخشا وُہ سہارا
ہر تلخیٔ دَوراں کو کیا ہم نے گوارا

جیتی ہوئی بازی کو پھر اک بار وُہ ہارا
یُوں دل نے لیا تیری نگاہوں کا سہارا

انکار کریں گے جو کنارے نے پُکارا
ہے عشق کی توہین کنارے کا سہارا

ہم شوق میں منزل سے بھی آگے نکل آئے
معلوم نہیں رُوح کو یہ کس نے پُکارا

ہر منزلِ دشوار کو آسان بنایا

کیا چیز ہے اے ذوقِ نظر تیرا سہارا

محتاج ہے اے عشق! فقط ایک نظر کا

تاروں کا نظارا ہے کہ پھولوں کا نظارا

کچھ جیت کا احساس ہے، کچھ ہار کا احساس

معلوم نہیں اصل میں جیتا ہوں کہ ہارا

میخانہ بدوش آئیں گلستاں پہ گھٹائیں

پاتے ہی تری مست نگاہوں کا اشارا

اے عقل! خدا تیرے سفینے کا محافظ

یہ عشق کا دریا ہے نہیں جس کا کنارا

گلشن بھی ترے اور بہاریں بھی تری ہیں

آزاد کا حصّہ ہے فقط زخمِ نظارا

پسِ پردہ

خیال تھا کہ صبحِ نو اُفق پہ جگمگائے گی
ہر اک بلند و پست پر نشاط بن کے چھائے گی
قریب و دُور تک ردائے نُور پھیل جائے گی
فلک بھی مُسکرائے گا زمیں بھی مسکرائے گی
کچھ اپنا رنگ اِس طرح یہ صبحِ نَو جمائے گی

خیال تھا کہ اِک بہارِ نو چمن میں آئے گی

چمن میں زندگی کی ایک لہر دوڑ جائے گی

جمود سے حیاتِ گلستاں نجات پائے گی

خزاں کا دور جائے گا بہار رنگ لائے گی

زمین گنگنائے گی حسین گُل کھلائے گی

خیال تھا کہ ظلمتوں سے ہم رہائی پائیں گے

خیال تھا کہ اپنے گھر کو اپنا گھر بنائیں گے

خیال تھا کہ مل کے جشنِ دورِ نو منائیں گے

خیال تھا کہ زندگی نجات غم سے پائے گی

خوشی کے ایک بحرِ بیکراں میں ڈوب جائے گی

خبر نہ تھی کہ وہ سحر منظر کو جس کا شوق ہے

ہر ایک راہرو کو رہ گذر کو جس کا شوق ہے

ہمارے بحر و بر کو خشک و تر کو جس کا شوق ہے

جب آئے گی تو ظلمتوں کی سیل ساتھ لائے گی

قریب و دُور پر مہیب رات بن کے چھائے گی

خبر نہ تھی بہار جس کی آرزو چمن کو ہے

بہار جس کی جستجو چمن کے بانکپن کو ہے

بہار جس کا انتظار سنبل و سمن کو ہے

جب آئے گی تو موجِ زہرناک ساتھ لائے گی

خزاں کی طرح آئے گی چمن میں پھیل جائے گی

غزل

ترتیبِ نشیمن کیا ہوگی آئینِ گلستاں کیا ہوگا

آغازِ بہاراں کچھ تو بتا انجامِ بہاراں کیا ہوگا

اندازۂ طوفاں ہوتا ہے طوفاں کے قریب آجانے سے

ساحل پہ بسیرا کرنے سے اندازۂ طوفاں کیا ہوگا

یہ گلشنِ نو ہے گلشنِ نو اے فکرِ کہن کے دیوانو!

بیمارِ تفکر آخر اِس گلشن میں غزل خواں کیا ہوگا

اِس دور میں بھی کام آئیں گی صدیوں کی یہ فرسودہ باتیں!

اے پیرِ دبستاں بول ذرا دستورِ دبستاں کیا ہوگا

جب مرغِ خوش الحاں دام و قفس انعام ہو خوش الحانی کا

پھر نغمہ سرا گلزار میں تو اے مرغِ خوش الحاں کیا ہوگا

جس غم سے تسکیں ملتی ہو اُس غم کا مداوا کون کرے

جس درد میں لذّت پنہاں ہو اُس درد کا درماں کیا ہوگا

تہذیب کا پرچم لہرایا ہر شہر و چمن ویران ہُوا

تعمیر کا ہے ساماں جو یہی تخریب کا ساماں کیسا ہوگا

ماحول کی گرد سے کچھ ایسا دُھندلایا حال کا آئینہ

کچھ اس میں نظر آتا ہی نہیں مستقبلِ انساں کیسا ہوگا

اے بھاگنے والے وقت ہے یہ ہاں صحنِ چمن سے بھاگ نکل

جب باغ قفس بن جائے گا اُس وقت گریزاں کیا ہوگا

نئی محفل

جس کا جشن تقسیمِ ہند کے بعد بہ یک وقت

ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں ہُوا

ہم اپنی انجمن کو بھول جائیں بھی تو کیا ہو گا

نئی محفل کو ہم اپنا بنائیں بھی تو کیا ہو گا

چمن بدلا چمن کا رنگ بدلا باغباں بدلے

یہاں اب ہم پُرانے گیت گائیں بھی تو کیا ہو گا

جہاں ہر سنگ پارے کو گہر کی شان حاصل ہو

نوادر ہم وہاں جا کر لُٹائیں بھی تو کیا ہو گا

جہاں چاروں طرف سے آندھیاں مذہب کی چلتی ہوں

وہاں ہم عقل کی مشعل جلائیں بھی تو کیا ہوگا

جہالت کے جہاں پتھر ہی پتھر راستے میں ہوں

وہاں ہم منطق کا دریا بہائیں بھی تو کیا ہوگا

خیرہ دشمن جہالت آفریں ماحول میں اے دل

ترانے ہم تمدن کے جو گائیں بھی تو کیا ہوگا

جنہیں ذوقِ نظر بخشا گیا تھا ہو چکے رخصت

ہم اب تارے فلک سے توڑ لائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں ذوقِ ادب کے نام سے دنیا بدکتی ہو

وہاں اب ہم ادب کے راگ گائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں انسان کو اونچے تخیل سے عداوت ہو

وہاں ہم موج میں تانیں اڑائیں بھی تو کیا ہوگا

دلوں کا غیظ جب اے دوست! چہروں پر نمایاں ہو

گلے شکوے زباں پر ہم جو لائیں بھی تو کیا ہوگا

جنوں ہی کارفرما ہو جہاں اطرافِ عالم میں

وہاں ہم عقل کی محفل سجائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں ماحول پر نفرت ہی نفرت راج کرتی ہو

وہاں ہم پیار کی دنیا بسائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں ہمدردیوں کا نام تک باقی نہ ہو دل میں

وہاں ہم درد کی دولت لٹائیں بھی تو کیا ہوگا

تو گہری نیند میں ہے جاگنا آساں نہیں تیرا

ہم اے مُردے ترے شانے ہلائیں بھی تو کیا ہوگا

تجلّی کا اب اس ماحول میں طالب نہیں کوئی

اندھیری رات میں ہم جگمگائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں ماحولِ انساں پر سکوتِ مرگ طاری ہو

وہاں ہم حوصلوں کو آزمائیں بھی تو کیا ہوگا

جب اس محفل میں سُننے پر نہیں ہے کوئی آمادہ

تو پھر ہم نطق کا جادو جگائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں آزاد تا حدِّ نظر بنجر زمینیں ہوں

گھٹائیں آن کر بارش لٹائیں بھی تو کیا ہوگا

غزل

اے دل اُلجھ گیا ہے مذاقِ نظر کہاں

منزل کہاں یہ حُسنِ سرِ رہ گذر کہاں

اک بار اگر قفس کی ہوا راس آگئی

اے خود فریب! پھر ہوسِ بال و پر کہاں

گم ہو چکی ہے کاہکشاں گردِ راہ میں

اب دیکھئے ہو ختم ہمارا سفر کہاں

مانا چمن میں حکم زباں بندیوں کے ہیں

رازِ جنوں کو فاش کریں ہم مگر کہاں

گلشن میں خامشی ہے مرے اس سوال پر

ٹھہرے گا کاروانِ نسیمِ سحر کہاں

خارا شگافیوں کے زمانے گذر گئے

اب ڈھونڈتا ہے شوق کہ ہیں شیشہ گر کہاں

آزاد چل کوئی نئی دنیا تلاش کر

جلوے یہاں بقدرِ مذاقِ نظر کہاں

جستجو

ہوس کو علم و فن کی آڑ میں چھپا رہا ہوں میں
سمجھ رہا ہوں یہ ترے قریب آ رہا ہوں میں

یہ جان کر کہ اپنے آپ کو بنا رہا ہوں میں
ابھی شعورِ خام کا فریب کھا رہا ہوں میں

خیالِ غرقِ آرزو، نگاہِ محوِ جستجو
پکارتی ہے زندگی کہاں ہے تُو کہاں ہے تُو
قریب و دُور ظلمتیں ہی ظلمتیں ہیں چار سُو
یہ اور بات ہے کہ آپ جگمگا رہا ہوں میں

عجب مقام ہے جہاں کوئی بھی رہنما نہیں
خرد کا آسرا نہیں جنوں کا آسرا نہیں
کہاں ہے منزلِ نظر مجھے کوئی پتہ نہیں
ابھی تو یہ خبر نہیں کہاں سے آ رہا ہوں میں

ادھر فلک کی نیلگوں فضا ادھر سحاب ہیں
ستارہ ہائے ضو فشاں ہیں مہر و ماہتاب ہیں
نگاہ پر ابھی تو رنگ رنگ کے حجاب ہیں
اگرچہ مدتوں سے یہ حجاب اُٹھا رہا ہوں میں

دو شعر

ہاں حریفِ قہقہہ آہِ سرد ہی سہی
لب تو خندہ ریز ہیں دل میں درد ہی سہی
پاؤں تھک گئے تو کیا آرزو میں دم تو ہے
آنکھ میں چمک تو ہے رخ پہ گرد ہی سہی

غزل

فضا کو دیکھ کے ذوقِ نظر پہ کیا گذری
نہ پُوچھئے ہوسِ بال و پر پہ کیا گذری

تمہیں کچھ اس کی خبر بھی ہے اے چمن والو
سحر کے بعد نسیمِ سحر پہ کیا گذری

یہ کاش تجھ کو بھی ذوقِ نظر بتا سکتا
تری تلاش میں ذوقِ نظر پہ کیا گذری

شکستہ شیشہ جو پھر شیشہ گر سے جڑ نہ سکا

خبر نہیں کہ دلِ شیشہ گر پہ کیا گذری

حضورِ دوست کا عالم بتا نہیں سکتا

میں کیا کہوں مرے قلب و نظر پہ کیا گذری

نظر تو محوِ غمِ جستجو تھی اے آزاد!

یہ اس کے ساتھ دلِ بے خبر پہ کیا گذری

طوفان کے بعد

سنہ ۱۹۴۵ء

رات جاتی ہے تو سامانِ سحر ہوتا ہے
مگر اس رات تو سامانِ سحر ہو نہ سکا
ختم گو ہو بھی چکا عالمِ ظلمات کا دور
انجمِ صبح نمودار مگر ہو نہ سکا

جا چکی رات مگر پو نہ پھٹی مشرق میں

تیرہ و تار فضاؤں کی سیاہی نہ گئی

ایک افسانہ ہُوا گرچہ خزاں کا عالم

صحنِ گلشن سے بگولوں کی تباہی نہ گئی

دیدۂ شوق نے سمجھا تھا کہ طوفان گئے

زندگی ایک سکوں پائے گی ہیجان کے بعد

لیکن اے آرزوئے دید! ذرا غور سے دیکھ

کتنے طوفان نمودار ہیں طوفان کے بعد

اپنے ماحول سے بیگانہ رہا جوشِ جنوں

عقل منزل کی طرف جا کے پلٹتی ہی رہی

سائنس آزاد فضاؤں میں کبھی لے نہ سکی

زندگی موت کے دامن میں سمٹتی ہی رہی

حیف صد حیف کہ انسان کا یہ فکرِ منیر

تُندطوفاں پہ ذرا سا بھی اثر کر نہ سکا

"جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا

زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا"

ہم نے مانا کہ ہے طوفان کا مفہوم یہی
زندگی کی شبِ تاریک سحر ہو نہ سکے
اپنی منزل تو نظر آئے خرد کو لیکن
اپنی منزل کی طرف اُس کا گذر ہو نہ سکے

باوجود اس کے ارادوں کا تقاضا ہے یہی
لڑکھڑاتی ہوئی دُنیا کو سنبھلنا ہے ضرور
تیز طوفان فضاؤں میں مچلتے ہی رہیں
مری بجھتی ہوئی قندیل کو جلنا ہے ضرور

غزل

اب ہیں سرگرمِ تلاشِ منزلِ جانانہ ہم
چھوڑ آئے ہیں حدودِ کعبہ و بُت خانہ ہم

مستِ صہبائے نظر ہیں ساقئ مے خانہ ہم
ہیں ازل سے بے نیازِ شیشہ و پیمانہ ہم

چاند تارے اب تو گردِ راہ میں گُم ہو گئے
کون سی منزل کے عازم ہیں دلِ دیوانہ ہم

یہ فقط آنسو نہیں اے چشمِ ظاہر بینِ دوست!
اپنی پلکوں پر لئے بیٹھے ہیں اک افسانہ ہم

ظلمتِ شب کی قسم پُر پیچ راہوں کی قسم

ساتھ دیں گے اب ترا اے ہمّتِ مردانہ ہم

داستانِ عشق سے رنگیں ہے دل کی کائنات

عشق افسانہ ہے لیکن سرخیٔ افسانہ ہم

زندگی دشوار سے دشوار تر ہوتی گئی

چھیڑ بیٹھے یا الٰہی کون سا افسانہ ہم

بوالہوس اِس خاک کا رتبہ ہمارے دل سے پُوچھ

جانتے ہیں عظمتِ خاکسترِ پروانہ ہم

ہم سے اے آزاد! حسن و عشق کی رمزیں نہ پوچھ

حُسن سے ناآشنا ہیں عشق سے بیگانہ ہم

آج اے آزاد! ہم محوِ غزل خوانی نہیں

بزم میں چھلکا رہے ہیں بلکہ اک پیمانہ ہم

اِس بزمِ جہاں کو کیا خبر تھی تیری
جو شام تھی دنیا کی سحر تھی تیری

جس پہ نہ پہنچ سکا خیال انساں کا
اُس عالمِ بالا پہ نظر تھی تیری

طوفانِ حوادث سے نہ ڈرنے والے

ہنس کھیل کے دُنیا سے گزرنے والے

اب کون سے گردوں کا ستارا ہے تو

اے بحرِ عمیق میں اُترنے والے

اے رفعتِ افلاک سے آنے والے

عالم کو بس اک جھلک دِکھانے والے

اب تک دلِ اہلِ دل میں تیرا ہے مقام

اے بحرِ فنا میں ڈوب جانے والے

غزل

پھر حسنِ خود نما پہ نظر کر رہا ہوں میں
پھر امتحانِ قلب و جگر کر رہا ہوں میں

پھر ہو رہا ہے درہم و برہم سکوتِ شب
نالوں سے چاک شب کا جگر کر رہا ہوں میں

دنیا میں مجھ کو جنسِ وفا کی ہے جستجو
خاشاک میں تلاشِ گہر کر رہا ہوں میں

اب دل کو ناپسند ہے پھولوں کا حسن و رنگ
شاید بلند ذوقِ نظر کر رہا ہوں میں

پھر دِل میں آ رہی ہے کسی بے وفا کی یاد
دُنیائے دل کو زیر و زبر کر رہا ہوں میں

اب لطفِ صبح و شام گیا صبح و شام سے
کچھ اس طرح حیات بسر کر رہا ہوں میں

تسکینِ جانِ زار! ترے انتظار میں
گو جاں گزا ہے صبر مگر کر رہا ہوں میں

ایک منظر

سناور کی بلندیوں سے

شاید ہو تجھے تلخیٔ ایّام گوارا

دیکھ لے اے دلِ مشتاق! کسولی کا نظارا

وُہ صبح کے دامن میں چھلکتے ہوئے انوار

وُہ شام کے ماتھے پہ چمکتا ہُوا تارا

کس حسن سے بدمست گھٹاؤں میں ہُوا غرق

کُہسار کی چوٹی کا فلک بوس کنارا

سرمست ہُوا ہے کہ ہے چلتا ہُوا جادُو

بدمست گھٹا ہے کہ جنوں کو ہے اشارا

لوگوں سے جو سنتے ہیں کہ جنّت بھی کوئی ہے

ممکن ہے کسی نے ہو یہی عکس اُتارا

پستی کو بلندی سے لڑھکتے ہوئے بادل

رفعت کو اُبھرتے ہوئے پانی کا نظارا

شاید تری رفتار سے ٹکرا کے گئی ہے

ملتا ہی نہیں ہے کوئی بدلی کو سہارا

یہ ابر یہ سبزہ یہ ہوائیں یہ گھٹائیں

کثرت نے دِکھایا مجھے وحدت کا نظارا

یہ عالمِ پُرکیف و سکوں ریز و جنوں خیز

جنّت کا تصوّر بھی نہیں دِل کو گوارا

غزل

مطمئن ہوں زلیست سے زلیست بار ہے تو کیا
زہر پی رہا ہوں میں ناگوار ہے تو کیا

عشق کے حضور میں سُرخرو تو ہو گئے
دامنِ حیات اگر تار تار ہے تو کیا

اپنی خلوتوں میں تو بے نیاز ہو کے رہ
انتظار میں کوئی بے قرار ہے تو کیا

مقصدِ حیات بھی غم کے ساتھ ساتھ ہے

کارواں کے ساتھ ساتھ اک غبار ہے تو کیا

تو بھی ہے فنا پذیر میں بھی ہوں فنا پذیر

میں ہوں گر خزاں تو کیا تو بہار ہے تو کیا

○

ہیں سامنے فلک ہی فلک بام و در کہاں

یاں اے جنونِ شوق خرد ہمسفر کہاں

لہروں کی زد پہ چھوڑ سفینے کو ناخدا

موجوں کا ہے یہ رقصِ دلآرا بھنور کہاں

سِرِّ محبّت

نہ بُود نقشِ دو عالم کہ رنگِ اُلفت بُود
زمانہ طرحِ محبّت نہ ایں زماں انداخت
(جامی)

اُس وقت بھی یہ راز فضاؤں پہ عیاں تھا
جس وقت نہ دُنیا تھی نہ دنیا کا نشاں تھا
جس وقت ابھی کُن کا اشارہ نہ ہُوا تھا
ظاہر کوئی دُنیا کا نظارہ نہ ہُوا تھا

جس وقت نہ سورج تھا نہ مہتاب نہ تارے

پنہاں کسی پردے میں تھے بجلی کے شرارے

جس وقت نہ گرمی تھی نہ سردی تھی نہ برسات

ظاہر تھے یہ جب شام و سحر اور نہ دن رات

جس وقت نہ موجیں تھیں نہ موجوں کا تلاطم

نَے ابرِ خروشندہ نہ باراں کا ترنّم

خاموش تھا جب محفلِ فطرت کا ہر اک ساز

اُٹھتی تھی نہ جس وقت کسی چیز سے آواز

جس وقت نہ بجلی تھی نہ بادل نہ بخارات

نَے معدنیات اور نہ آثارِ نباتات

جس وقت نہ جنگل تھے نہ صحرا نہ بیاباں

نَے رفعتِ کہسار تھی نَے وسعتِ میداں

جس وقت نہ گھر کر کبھی آتی تھیں گھٹائیں

ہر وقت تھیں اک حال پہ خاموش فضائیں

جس وقت نہ تارے تھے نہ تاروں میں اشارے

معدوم تھے جب چاندنی راتوں کے نظارے

جس وقت نہ بُلبُل تھا نہ گُل تھا نہ گلستاں

اک حال پہ رہنے سے فضائیں تھیں پریشاں

جس وقت نہ گنگا تھی نہ گنگا کی روانی

نے رود اباسین کا مچلتا ہُوا پانی

جب صفحۂ ہستی پہ مکیں تھا نہ مکاں تھا

ہنگامہ یہ سب غیب کے پردے میں نہاں تھا

جس وقت نہ دُنیا تھی نہ دُنیا کا نشاں تھا

اُس وقت بھی یہ راز فضاؤں پہ عیاں تھا

غزل

خرد بھی سر گشتہ و پریشاں اسے کہاں ضبط کا تھا یارا

مرے جنوں کا ہے یہ کرشمہ کہ تیرا غم کر لیا گوارا

دل و نظر کو کسی کی یادِ حسیں نے بخشا ہے وہ سہارا

کہ اب زمانے کا ہر ستم ہے دل و نظر کے لئے گوارا

یہ بات ہی اور ہے کہ ہم کو نہیں یہاں گفتگو کا یارا

دگرنہ یہ بازیٔ محبّت نہ حُسن جیتا نہ عشق ہارا

وہ دل عطا کر کہ جس کو ہوں پردہ ہائے گردوں بھی ناگوارا

نگاہ وہ دے کہ سنگِ خارا کو چیر کر دیکھ لے شرارا

یہ عالمِ رنگ و بُو کو آزاد! کون سے ہاتھ نے سنوارا

جنوں کو حیرت ہے عقل گُم ہے نظر کا دامن ہے پارہ پارہ

مرے سفینے مرے کنارے یمِ محبّت کے تند دھارے

نہ اب سفینے کی آرزو ہے نہ اب نگاہوں میں ہے کنارا

خبر نہیں بات کیا ہے جب سے چمن کے آنسو نکل پڑے ہیں

نہ جانے کیا کچھ بتا گیا ہے چمن کو یہ صبح کا ستارا

بھنور سے طوفاں سے خوف کیسا یمِ محبّت میں آ پڑا ہے

تری نظر ہے یقیں سے عاری وگرنہ ہر موج ہے کنارا

اگرچہ طوفانِ ابر و باراں فضاؤں پر ہے محیط لیکن

ثبات اپنا دکھا رہا ہے کہیں کہیں کوئی کوئی تارا

تری وفا کا، تری محبّت کا موجِ طوفاں اب امتحاں ہے

وُہ اپنی رعنائیاں دِکھا کر بُلا رہا ہے مجھے کنارا

بہار لائے گی نکہتوں کا جب ایک طوفاں تو کیا کریں گے

نہ رنگ و بو تھا نہ زمزمے تھے خزاں میں تو ہو گیا گزارا

نہ حل ہُوئیں مشکلیں نظر کی اگرچہ دُنیائے رنگ و بُو میں

کبھی خرد پر کیا بھروسہ کبھی جنوں کا لیا سہارا

کبھی حوادث سے جنگ کر کے کبھی حوادث میں رنگ بھر کے

جنھیں تھا سودا سنوارنے کا انھوں نے قسمت کو یوں سنوارا

نہ ہو تمناؤں میں جو خامی تو کیا ہے گردوں کی پردہ بندی

کہ عشق کی اِک نظر جو چاہے تو چیر دے اندرونِ خارا

سنبھال کر ہم نے پھر بھی رکھا ہُوا ہے آزادِ غم کسی کا

اگرچہ زورِ جنوں کے ہاتھوں ہے دامنِ دل ہزار پارہ

آزادی کے بعد

گرد دامن سے غلامی کی چھڑانے والے

ترے ماتھے پہ غلامی کا نشاں آج بھی ہے

جو سماں تیری نگاہوں سے نہاں ہے شاید

وُہ سماں میری نگاہوں پہ گراں آج بھی ہے

تو بہاروں کا فسوں دیکھ کے مسحور نہ ہو

تو بہاروں کے تعاقب میں خزاں آج بھی ہے

آج بھی رُوح میں ہے درد کی دُنیا آباد
دمِ بجود کانپتے ہونٹوں پہ فغاں آج بھی ہے

آج بھی دِل میں ہیں بے تابِ تکلّم نالے
اور سینے میں دلِ زار طپاں آج بھی ہے

جلوہ فرمائی پہ حسن آج بھی آمادہ نہیں
عشق کی ڈوبتی نظروں میں فغاں آج بھی ہے

آج بھی دیدۂ افکار پہ پردے ہیں محیط
حل طلب مسئلۂ سود و زیاں آج بھی ہے

عندلیب آج بھی گلزار میں ہے محوِ فغاں
درد ہر پھول کے سینے میں نہاں آج بھی ہے

یہ الگ بات ہے تو اِس کو نہ دیکھے لیکن
ترے ماحول میں آہوں کا دھواں آج بھی ہے

رنگ محفل کا بدلتا نظر آتا ہی نہیں
ایک کا سُود ہزاروں کا زیاں آج بھی ہے

آج بھی بندۂ و آقا میں تفاوت ہے وہی
دیدۂ عدل بہر سُو نگراں آج بھی ہے

آج بھی شور فضا میں ہے وہی محنت کا
گوشش سرمایہ پہ یہ شور گراں آج بھی ہے

نصب باغات میں بُت اب بھی ہیں انگریزوں کے
اور شہنشاہ کا سکّوں پہ نشاں آج بھی ہے

آج بھی مفت نظر ہے وہی سینوں کا عناد
بند اخلاص و محبّت کی دکاں آج بھی ہے

دین و دُنیا میں کوئی ربطِ بہم ہے کہ نہیں
سوچ میں انجمنِ دیدہ وراں آج بھی ہے

اِس نئے عصر میں انصاف کی اے جنسِ لطیف

صاف کہہ کوئی ترا مرتبہ داں آج بھی ہے؟

کون اِس دَور میں ماحول کا ہو شکوہ طراز

نطق پروردۂ احکام رواں آج بھی ہے

○

ہائے وہ میرے مذاقِ دید کی تابانیاں

رات کی ظلمت کو جب نُورِ سحر سمجھا تھا میں

غزل

ہر سانس تھا اک دِل کش و رنگین ترانہ

اے کاش کبھی لوٹ کے آئے وُہ زمانہ

وُہ صبح کے آثار نہ وُہ لطفِ صبوحی

وُہ شام کے انوار نہ وہ کیفِ شبانہ

اے سروِ سرافراختہ، ہاں پھر وُہ شہانہ

اے مطربِ نوخاستہ اک لحنِ چغانہ

عشرت کدۂ جادوئے بابل ہیں لبِ لعل

آنکھیں تری حیرت کدۂ سحرِ مغانہ

اے گردشِ ایّام! خبردار خبردار

آساں نہیں کچھ نقشِ تمنّا کا مٹانا

عشق اور خرد میں جو تفاوت ہے تو یہ ہے

عشق ایک حقیقت ہے خرد ایک فسانہ

پھولوں سے بہاروں سے ستاروں سے گذر جا

ہے دُور کہیں ذوقِ نظر تیرا ٹھکانہ

کیا جانیئے آزاد! مرا عشقِ جنوں خیز

جینے کا سہارا ہے کہ مرنے کا بہانہ

دو آتشہ

ابو سعید ابو الخیرؒ کی رُباعیات

دِن گزرا غمِ جہانِ فرسودہ میں
اور شب ہوسِ بودہ و نابودہ میں
القصّہ حیاتِ بیش قیمت ساری
گذری یونہی فکر ہائے بیہودہ میں

وصل اُس کا کہاں اور یہ مہجور کہاں
دُردانہ کہاں حوصلۂ مُور کہاں
ہر چند کہ خوف مجھ کو جلنے سے نہیں
پروانہ کہاں اور آتشِ طُور کہاں

(۲)

شاعرِ مشرق علّامہ اقبال کے افکار

دُنیائے دِل

دُنیائے دِل میں دلکشئ رنگ و بُو نہیں

اِس میں بلند و پست نہیں کاخ و کُو نہیں

گردوں نہیں زمین نہیں چار سو نہیں

عالم یہ وُہ ہے جس میں جُز اللہ ہُو نہیں

(ارمغانِ حجاز)

نیند اور موت

نیند کیا ہے ذرا سی دیر کی موت

موت کیا ہے تمام عمر کی نیند

(پیامِ مشرق)

رُباعیات

دریں صحرا بہ ایں حالِ تباہے

نہ بیند چشمِ حیرانِ تو راہے

بیا با من حضورِ پیرِ مشرق

کہ از فیضانِ اُو یابی نگاہے

○

بگیر ایں نکتۂ روشن ز اقبال

کہ روشن تر ز مہر و ماہتاب است

"جہاں تابی ز نورِ حق بیاموز

کہ اُو با صد تجلّی در حجاب است"

بمن گفت ایں بہ خلوت ساقیٔ من

ہنوز از گفتہ اش جاں در خروش است

"مئے من گرچہ ناصاف است در کش

کہ ایں تہ جرعۂ خمہائے دوش است"

○

چہ خوش گفتا فقیرے بے گلیمے

حضور گفتہ اش لعل و گہر چیست

"چو یزداں از دو گیتی بے نیاز اند

دگر سرمایۂ اہل ہنر چیست"

غزل

مری نگاہ کو سجدے کا حوصلہ ہی نہ تھا

اگرچہ میں بھی ترے آستاں سے گزرا ہوں

گماں کی راہ دکھائی ہے پھر یقیں نے مجھے

کبھی کبھی جو حدودِ گماں سے گزرا ہوں

کہیں مذاقِ نظر کو قرار مل نہ سکا

کبھی چمن سے کبھی کہکشاں سے گزرا ہوں

ترے قریب سے گزرا ہوں اس طرح کہ مجھے
خبر بھی ہو نہ سکی میں کہاں سے گزرا ہوں

دیارِ دوست سے گزرا تو ہوں مگر آزاد
عجیب بے خبری میں وہاں سے گزرا ہوں

○

اپنے جلووں کو مری حسنِ نظر سے نہ چھپا
کہ صلہ چاہتی ہے میری پریشاں نظری

چاندنی اُتری پُھلواری میں

باغ پہ کس نے جادو پھیرا   پُھولوں کو نیند آئی
ڈال ڈال پر پات پات پر   مستی سی لہرائی

چاندنی اُتری پُھلواری میں
پھلواری مُسکائی

پھول پھول پر کلی کلی پر | بھونرا آ کر گھومے
جانے اُس کے من میں کیا ہے | کلیوں کا مُنہ چومے

چاندنی اُتری پھلواری میں
پھلواری مُسکائی

اپنی دُھن میں گاتی مکھّی | رس پینے کو آئی
پھلواری کے نام نہ جانے | کیا سندیسہ لائی

چاندنی اُتری پھلواری میں
پھلواری مُسکائی

رات کی رانی دُور کہیں سے | اپنا راگ سُنائے
گھولتی جائے کانوں میں رس | من میں بیٹھتی جائے

چاندنی اُتری پھلواری میں
پھلواری مُسکائی

بھولے من! آخر یہ نظارہ   کیوں تجھ کو تڑپائے
بھید کی باتیں پوچھنے والے   کون تجھے سمجھائے

چاندنی اُتری پھلواری میں
پھلواری مسکائی

غزل

شوق پابندِ فضائے چمنستاں نہ ہُوا
دِل مرا جورِ خزاں سے بھی پشیماں نہ ہُوا

صدمۂ ہجر سے دِل جلوہ بداماں نہ ہُوا
چوٹ کھا کر بھی یہ پتھّر شرر افشاں نہ ہُوا

آدمی ہو کے بھی دُنیا میں وہ انساں نہ ہُوا
ننگ و ناموسِ وطن کا جو نگہباں نہ ہُوا

تری نظروں میں علاجِ غمِ دوراں ہے مگر

ان سے اپنا تو علاجِ غمِ دوراں نہ ہُوا

فصلِ گُل آئی بھی اور باغ سے رخصت بھی ہوئی

آہ وہ شوقِ فسردہ کہ غزل خواں نہ ہُوا

نہ ہوئی برق چمک کر بھی تبسّم کا جواب

پھول کھل کر بھی حریفِ رُخِ جاناں نہ ہُوا

میں نے چاہا تھا بہاروں میں سما جاؤں مگر

یہ نظارہ بھی مرے شوق کے شایاں نہ ہُوا

کنارِ راوی

ایک کیفِ سرمدی سا عالم پہ چھا رہا تھا
دُنیا کا ذرّہ ذرّہ مستی میں آ رہا تھا

ہر چیز چاندنی سے زرپوش ہو رہی تھی
گردوں سے ماہِ تاباں سونا لٹا رہا تھا

دو موسموں میں باہم تھا اتّصال گویا
اک وقت آ رہا تھا اک وقت جا رہا تھا

راوی کے پُل کے نیچے تھیں نغمہ بار لہریں
لہروں کا راگ دل کو بے خود بنا رہا تھا

موجوں سے ہلکے ہلکے گرداب پڑ رہے تھے

منظر یہ میرے دل میں طوفاں اٹھا رہا تھا

اُس رات کی نہ پوچھو اُس رات کا نظارہ

احساس بن کے میرے دل میں سما رہا تھا

پل بھر میں دل کی لیکن حالت ہوئی دگرگوں

اس منظرِ حسیں سے دِل دُور جا رہا تھا

اک انقلاب آیا ہر شے کی دل کشی میں

جو دل نشیں تھا منظر اب دل کو کھا رہا تھا

اب منظرِ حسیں پر جمتی نہ تھیں نگاہیں

کوئی دلِ حزیں کو پھر یاد آ رہا تھا

غزل

جینا ہے غم سہنا ہے غم سہہ کر مر جانا ہے

دل اور دل کی دنیا کا بس اتنا افسانہ ہے

پھولوں کے متوالو کیا باغ سے پیار بڑھانا ہے

شاخ پہ دو دن رہنا ہے گانا ہے اُڑ جانا ہے

محفل میں آنے والے اپنے دانوں کا کھیل بھی دیکھ

دوست کی محفل میں آ کر اب واپس کیا جانا ہے

راہِ سفر کی دشواری اور منزل سے بیزاری

یہ تو روز کی باتیں ہیں ان سے کیا گھبرانا ہے

راہِ طلب دشوار سہی، یہ وادی پُرخار سہی

چلنا اک آزار سہی لیکن چلتے جانا ہے

عالمِ فانی میں اے دل! اُن کا تبسّم دیکھ جنہیں

صبح کو شاخ پہ کھِلنا ہے شام کو مُرجھا جانا ہے

یہ آباد سا ویرانہ یہ ویران سی آبادی

دل بھی عجب آبادی ہے دل بھی عجب ویرانہ ہے

اِس میخانے میں اپنے شوقِ طلب کی بات نہ پُوچھ

روزِ ازل سے شوقِ طلب ایک نگوں پیمانہ ہے

اپنی محفلِ شوق آزاد جن کی ضیا سے روشن تھی

اب وہ شمعیں بجھ بھی گئیں اب واپس کیا جانا ہے

اُمید

تُند ہوئیں پُر کیف ہوائیں گِھر کر چھائیں مست گھٹائیں
ہو گئیں ظُلمت پوش فضائیں

بزمِ جہاں کو آناً فاناً تاریکی نے گھیر لیا ہے

دیکھ وُہ چمکا ایک ستارا روشن روشن پیارا پیارا
رُوح کی تسکیں حسیں کا نظارا
مست گھٹاؤں سے بے پروا ظلمت کے طوفاں میں کھڑا ہے

یہ تارا اِن طوفانوں میں کُہساروں میں، میدانوں میں
آبادی میں ویرانوں میں
عزم کی مشعل ہاتھ میں لے کر اے دِل! تیرا راہ نما ہے

غزل

اس معمورۂ فانی میں گلزار ہیں یا ویرانے ہیں
یہ بھی ترے کاشانے اے دل وہ بھی ترے کاشانے ہیں

غم کا اِنھیں احساس کہاں احساس سے یہ بیگانے ہیں
دیوانوں کی بات ہی کیا ہے دیوانے دیوانے ہیں

رات کے یہ تاریک مناظر صبح کی رنگین فضا
یہ بھی تری روداد ہے اے دل! وہ بھی ترے افسانے ہیں

تو اپنوں کو ڈھونڈ رہا ہے دنیا کے معمورے میں
یہ بیگانہ وطن ہے اے دل! اس میں سب بیگانے ہیں

رات جنہوں نے محفل کو انداز سکھائے جینے کے

خاکستر کو دیکھنے والے! ہاں یہ وہی پروانے ہیں

انسانوں کو ڈھونڈنے والے ذوقِ نظر! مایوس نہ ہو

یہ آبادی یہ معمورے اصل میں سب ویرانے ہیں

شعر و سخن میں ناممکن اظہار ہے جن افسانوں کا

پلکوں پہ بیتاب سے قطرے وہ خاموش افسانے ہیں

منزل سے بھی ناواقف ہیں راہ سے بھی آگاہ نہیں

اپنی دھن میں پھر بھی رواں ہیں یہ بھی عجب دیوانے ہیں

یہ تنہائی یہ ویرانہ شام کی یہ غمناک فضا

تم کو جو سو بار سنائے ہاں یہ وہی افسانے ہیں

خاک پہ دھندلے نقش فضا میں مٹتی مٹتی آوازیں

ایک نظر آزاد! کہ یہ بھی چند جمیل افسانے ہیں

انڈیا گیٹ

انڈیا گیٹ کی رفعت ہے نگاہوں پہ محیط

انڈیا گیٹ وہ تاریخ کا اک بابِ جلیل

انڈیا گیٹ وہ افرنگ کی تعمیرِ جمیل

انڈیا گیٹ وہ اغیار کی نُصرت کا نشاں

انڈیا گیٹ وہ اپنوں کی غلامی کی دلیل

کشورِ ہند کے جانباز محبّانِ وطن
خون سے سینچنے نکلے ہیں بہاریوں کا چمن
ایک سیلاب شجاعت کا بڑھا آتا ہے
کہیں دجلے کی ہیں لہریں کہیں امواجِ جمن

واہ کیا جوش تہوّر کا ہے اللہ غنی
ہر قدم سے ہے عیاں حسرتِ شمشیر زنی
بھوک ہر شخص کو جانباز بنا دیتی ہے
اور افلاس رہِ منزلِ حبّ الوطنی!

دشت و کہسار پہ رکھتے ہیں کچھ اس طرح قدم
زیر و بم چال کا کھاتا ہے ارادوں کی قسم

ہند کی فوجِ ظفر موج جہاں جائے گی

گاڑ دے گی وہیں انگریز کی نُصرت کا عَلَم

سامنے دیدۂ مشتاق کے موجود ہے کیا

زندگانی کے خزانے سے یہ مفقود ہے کیا

اوجِ افلاک کو تو بال کُشا ہے لیکن

مرے اخلاص تری منزلِ مقصود ہے کیا

انڈیا گیٹ کی رفعت ہے نگاہوں پہ محیط

سنہ ۱۹۴۲ء

غزل

امتحاں کی منزل تک تیرے شوق کے صدقے ہم رواں دواں پہنچے
ورنہ یہ وُہ منزل ہے جس کو ڈھونڈنے والے کیا خبر کہاں پہنچے

گلستاں کو دیکھ آئی، کہکشاں سے ہو آئی، آسماں کو چھو آئی
اے نگارِ ناپیدا اب تری تمنّا میں آرزو کہاں پہنچے

ہنس کے دیکھنے والے، تیری بے وفائی کا غم جہاں پہ لے آیا
اس مقام پر ہم کو اب نہیں گوارا یہ غم کو کچھ زیاں پہنچے

کاوشِ مسلسل کا کیا دیا صلہ مجھ کو تم سے کیا ملا مجھ کو

میں تو یہ سمجھتا تھا زیست مسکرا اُٹھّی تم جہاں جہاں پہنچے

دوست کے تجسّس میں ہم نکل گئے اکثر منزلوں سے بھی آگے

ساتھ چھوڑنے والو اب تمہیں بتائیں کیا ہم کہاں کہاں پہنچے

نکہتیں یہ کہتی ہیں لالہ زارِ اُردو میں پھر بہار پیدا ہے

حیف باغبانوں پر اس چمن میں اے آزاد اب اگر خزاں پہنچے

اُمیدِ موہوم

سنہ ۱۹۴۰ء

یہ سماں دیکھ کے زنداں میں ہے تو مست خرام

کہ مٹا چاہتا ہے بزمِ گلستاں کا نظام

اس کی بربادی پہ یُوں شاد نہ ہو مُرغِ قفس

کہ یہ ہنگامِ مسرّت ہے نفس یا دو نفس

جن کے ہاتھوں سے ہے برباد گلستاں کی زمیں

وُہ بھی تیرے لئے بیگانے ہیں اپنے تو نہیں

آ کے تاراج کریں گے جو گلستاں تیرا

تو سمجھتا ہے کہ توڑیں گے وُہ زنداں تیرا!

آہ اے مُرغِ قفس خامِ خیالی پہ نہ پھُول

وُہ بھی اپنے نہیں اغیار ہیں! اغیار نہ بھُول

دیکھ حالات یہ پیغام لیے آتے ہیں

وُہ بھی ہم رنگِ زمیں دام لیے آتے ہیں

چمنستاں کے لئے دُھول لیے آتے ہیں

تیرے زنداں کے لیے پھُول لیے آتے ہیں

جن کی نکہت سے ترے گھر کو وہ مہکائیں گے

جن کی رنگت سے ترے دل کو وہ بہلائیں گے

زندگانی کے حوادث سے ڈرائیں گے تجھے

تجھ کو بیدار جو پائیں گے سُلائیں گے تجھے

تری امیّد سے مایوس کریں گے تجھ کو

تیرے زنداں ہی سے مانوس کریں گے تجھ کو

یوں دلآویز بنے گی ترے زنداں کی فضا

کہ نہ آئے گی تجھے یاد گلستاں کی فضا

مٹ بھی جائے اگر آج اس چمنستاں کا نظام

پھر بھی تبدیل نہ ہو گا ترے زنداں کا نظام

کہ یہ سقفِ فلک فطرتِ صیّاد ہے ایک

شرق سے غرب تلک فطرتِ صیّاد ہے ایک

یہ وہ شے ہے کہ بدلتی نہیں حالات کے ساتھ

غیر ممکن ہے اسے اُنس مساوات کے ساتھ

جب ہو دُنیا میں خزاں اس کا چمن کھلتا ہے

اس کے بھپرے ہُوئے جذبے کو سکوں ملتا ہے

ہاں تو مٹنے جو لگا ہے چمنستاں کا نظام
اپنے زنداں ہی میں نہ ہو مُرغِ قفس مستِ خرام

کسی انصاف کی صیّاد سے اُمید نہ رکھ
کرم و رحم کی جلّاد سے اُمید نہ رکھ

خار زاروں سے اُمیدِ گُلِ رنگیں ہے فضول
کبھی طوفاں سے بھی ہو سکتا ہے تسکیں کا حصول

متمنّی گہر و لعل کا ہے خاک سے کیوں
طالبِ رحم ہے تو گردشِ افلاک سے کیوں

کر نہیں سکتے نہ افلاک مداوا تیرا
ہے تری ضربتِ بے باک مداوا تیرا

غزل

نغمۂ چمن کی خاک پہ برسا رہا ہوں میں

پھولوں کو موجِ شوق سے مہکا رہا ہوں میں

سانسوں کے ساتھ ساتھ اڑا جا رہا ہوں میں

لحظہ بہ لحظہ تیرے قریب آ رہا ہوں میں

کوئی یہ میرے ہمسفروں کو پیام دے

کچھ دیر انتظار کریں آ رہا ہوں میں

اب محفلِ فنا بھی نگاہوں سے چھپ گئی

کتنی بلندیوں پہ اُڑا جا رہا ہوں میں

تہذیبِ کُہنہ میری شرافت پہ ناز کر

دھوکا دیا ہے دوست نے شرما رہا ہوں میں

اِک بے وفا کی نذر کروں پھر وقارِ عشق

کیا آرزو ہے جس پہ مٹا جا رہا ہوں میں

آزاد کوئی مجھ سے یہ پُوچھے تو کیا کہوں

دانستہ کیوں فریبِ وفا کھا رہا ہوں میں

بورڈ آف انٹرویو

دفتر کے اندر   چند ایک افسر
ذوقِ نظر سے   بے بہرہ یکسر
بیٹھے ہوئے ہیں   رزّاق بن کر

دورِ سحر میں
شب رنگ منظر

خوش فکر و خوش پوش
باہر جواں ہیں
بیٹھے ہیں سارے
چُپ چاپ خاموش
علمی بلندی
پستی سے ہمدوش
آلام فردا!
آسائشِ دوش

چہروں سے ظاہر
افکارِ عالی
جادو بیانی
شیریں مقالی
آئی ہوئی ہے
بن کر سوالی
اے ہند تیرا
اللہ والی!

اشعار

کہاں کہاں نہ ترا شوق لے گیا دل کو
کہاں کہاں نہ تری جستجو نے خوار کیا
بھلا ہُوا کہ میسّر تو آئی مایوسی
بُرا کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا

نہ اب وُہ رات کے نالے نہ فریادِ سحرگاہی

مداوا بن گیا خود دردِ پیہم دردِ پیہم کا

○

غمِ دوراں کی ہوائیں تھیں بہت تیز مگر

ترا شعلہ غمِ جاناں کبھی مدھم نہ ہُوا

○

بڑی مدّت رہا مصروفِ سعیِ لب کشائی میں

بڑی مشکل سے میرے لب پہ حرفِ ناتمام آیا

○

تری نگاہِ پُر آشوب پر نہیں موقوف

مرا سفینۂ دل ہے ازل سے طُوفانی

ترے وصل میں کہاں تھا یہ سرورِ تشنہ کامی

مرے کام آئی آخر مری آرزو کی خامی

○

بہ کامم بادہ ذوقِ جدائی خوشگوار آمد

غمِ فرقت بہ جانِ بیقرارم سازگار آمد

○

خدا کرے کہ مسلسل اک اضطراب رہے

خدا کرے کہ میسر نہ ہو وصال ترا

○

بس اتنا جانتا ہوں کوئی ہمسفر نہیں

یہ کیا مقام ہے مجھے اتنی خبر نہیں

میرے شوقِ بندگی کو حسرتِ یک سجدہ ہے

تجھ کو اے عمرِ گریزاں فرصتِ یک سجدہ ہے؟

○

ہزار نور سے لبریز ہو ستارہ ترا

جو آندھیوں میں درخشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

صدف ہے آنکھ تو آنسو ہے قطرۂ نیساں

صدف میں قطرۂ نیساں نہیں تو کچھ بھی نہیں

چمن سے دور بھی ہو عندلیب بال کشا

مگر اسیرِ گلستاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

○

کچھ دید کے قابل ہے جہاں میں تو یہی ہے

اے دیدۂ دل بے رُخیٔ اہلِ جہاں دیکھ

کلکتہ

سنہ ۱۹۴۶ء

کلکتہ ہُوا آگ کے شعلوں میں گرفتار
دیکھ اے دلِ آزاد قیامت کا نظارا
لے آئی ہے تہذیب کہاں فکر و نظر کو
اِنساں کو نہیں ہستیٔ انساں بھی گوارا

وُہ آگ کے شعلوں میں تڑپتے ہوئے انساں
وُہ خون کے دریاؤں میں بہتے ہُوئے لاشے
دُنیا ہے انہیں دیکھ کے انگشت بدنداں
اے اہلِ وطن تم نے دکھائے جو تماشے

یہ قہر خدا کا ہے نہ غصّہ ہے قضا کا
یہ آگ خود انسان کی بھڑکائی ہوئی ہے
یہ ظلم، یہ بیداد، یہ لعنت، یہ تباہی
انسان کی انسان پہ خود لائی ہُوئی ہے

انسان کا انسان پہ یہ ظلم یہ بیداد
یہ جنگ نہیں جنگ سے کچھ بڑھ کے سماں ہے،
ہے عزم کہ اک شہر خموشاں میں بدل جائے
یہ شہر کہ محشر کدۂ آہ و فغاں ہے

اِس آفتِ جانکاہ سے مصئوں نہیں کوئی
بچّے بھی گرفتار ہیں بوڑھے بھی گرفتار
عالم وہ ہے محفوظ نہ عزّت ہے نہ جاں ہے
کوئی نہ محافظ نہ مددگار نہ غم خوار

یہ آتش و آہن کی حکومت کا زمانہ
ہر دل ہے پریشان، قیامت ہے قیامت

انساں کا لہو اور ہو پانی سے بھی ارزاں
اب دُھل نہ سکے گا یہ کبھی داغِ ندامت

اک راز ہے اک راز نئے دَور کی تہذیب
آزاد کوئی فاش کرے مجھ پہ خدا را

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر، یہ سیاست
مرنے کا بہانہ ہے کہ جینے کا سہارا

کسان

اے فرض سے بیگانی دُنیا میں اپنے فرض کے دیوانے

اے کام پہ جاں دینے والے! آرام و سکوں سے بیگانے

دیہات میں رہ کر شہروں کے گلزار کو مہکانے والے

ہر اک کو نعمت دے دے کر خود نانِ جویں کھانے والے

یہ پھل ہے تیری کمائی کا رونق ہے جو بازاروں میں

ہے تیری جنسِ وفا پنہاں اجناس کے اِن انباروں میں

سلطاں بھی ہے دست نگر تیرا درویش بھی ہے محتاج ترا

افسوس تو یہ ہے کوئی بھی ممنون نہیں ہے آج ترا

محنت سے تری عشرت رہتی ہے رقصاں عشرت گاہوں میں

راتیں تیری کٹتی ہیں مگر کچھ نالوں میں کچھ آہوں میں

سورج کے نکلنے سے پہلے کھیتوں میں پہنچ جانے والے

اور رات کو چھاؤں میں تاروں کی اے لوٹ کے گھر آنے والے

اب خواب گراں سے جاگ کہ ہیں تیرے بھی دن پھرنے والے

رنگین جو تیرے خوں سے ہوئے اب ہیں وہ محل گرنے والے

سوامی رام تیرتھ

عجب خاکِ ہے خاکِ پنجاب بھی
کہ بے حس بھی ہے اور بیتاب بھی
بجا ہے اگر اس کو مُردہ کہیں
فضول اس کو سمجھیں فسردہ کہیں
جو فتنہ اُٹھا وُہ یہیں سے اُٹھا
اِسی خاکِ ظلمت قریں سے اُٹھا

تعصّب کا اس پر پڑا ہے حجاب

وطن کی ترقی میں ہے سدِّ باب

یہ پہلو ہے ایک اس کی تصویر کا

بہت خوش نما ہے مگر دوسرا

یہ پستی کا پہلو بلندی کا وُہ

یہ خفّت کا اور ارجمندی کا وُہ

اِسی دوسرے سے یہ تابندہ ہے

جہاں میں معزّز ہے اور زندہ ہے

کئے اس نے پیدا وُہ صاحب کمال

نہیں جن کی دُنیا میں پیدا مثال

انہیں میں سے اِک رام تیرتھ ہُوا

ملی جس کو بزمِ فنا میں بقا

وُہ عارف وہ درویشِ روشن رواں
وُہ آزادِ بندِ زماں و مکاں
اسی خاک سے آشکارا ہُوا
اسی آسماں کا ستارا ہُوا
وہ موتی تھا اُس پر کرن جب پڑی
تو اس میں چمک اس قدر آگئی
کہ یکسر کرن بن گیا وُہ گہر
نہ تھا جس پہ مٹّی کا کچھ بھی اثر
رہا یُوں زمانے کے گرداب میں
کنول جس طرح عالمِ آب میں
نگاہوں سے اوجھل ہُوا اس طرح
سمندر میں جُوئے رواں جس طرح

زمانے کی منزل سے اُس کا سفر
نسیمِ سحر سے بھی تھا خوب تر
شرارہ تھا انوار میں کھو گیا
وُہ قطرہ تھا دریا میں گم ہو گیا

اشعار

نو بہاروں کو چمن میں فرصتِ یک لحظہ ہے
اے تمنّا نو بہاروں سے کوئی پیماں نہ کر
یہ فریبِ رنگ و بو کچھ دیر رہنا چاہیئے
ورنہ توہینِ مذاقِ دید کا ساماں نہ کر
اپنے ہر عقدے کو اے آزاد لاینحل بنا
مُشکلوں کا ساتھ دیتا جا انہیں آساں نہ کر

غزل

جلوے ہزار ذوقِ نمائش سے کام لیں
خودداریٔ جنوں کا تقاضا ہی اور ہے

اے حُسنِ بے نیاز! نہ کر دلبری پہ ناز
ٹُوٹے ہُوئے دِلوں کی تمنّا ہی اور ہے

واقف ہے جن کی آنکھ مآلِ بہار سے
اُن کے لیے چمن کا تماشا ہی اور ہے

ذوقِ جنوں خود پہ کرے التفات کیا
منزل ہی اس کی اور ہے رستہ ہی اور ہے
دُنیا ہے جن کے فیض سے اک جنّتِ نگاہ
اُن کی نظر ہی اور ہے دُنیا ہی اور ہے

○

جو نہیں بہار نصیب میں تو مجھے کچھ اِس کا الم نہیں
کہ تری خزاں کا فریب بھی تری نو بہار سے کم نہیں
نہ فریب دے مجھے دَیر کا نہ مجھے طلسمِ حرم دِکھا
میں پرے ہوں دیر و حرم سے اب مجھے شوقِ دیر و حرم نہیں

تاجور نجیب آبادی

اعزاز دیا تجھ کو جو شمس العلماء کا

سرکار نے سمجھا کہ بڑھائی تری توقیر

عمّالِ حکومت سے یہ ہرگز نہیں پنہاں

توصیف کی محتاج نہیں ہے تری تحریر

عالم پہ ہویدا ہے ترے شعر کی رفعت

دُنیا میں نمایاں ہے تری نثر کی تاثیر

تیری نگہِ فیض سے پیدا ہوئی اکثر

پتھّر میں چمک خاک میں خاصیتِ اکسیر

ہر دِل ہے تری جدّتِ افکار کا قائل

ہر آنکھ پہ روشن ہے ترے فکر کی تنویر

جبریل ترے دامِ تفکّر میں گرفتار

پروازِ تخیّل ہے تری راست ترازِ تیر

ہوں فاخر و بیدار جس اُستاد کے شاگرد

نغمات میں ہے جن کے نہاں سحر کی تاثیر

کیا اُس کی فضیلت کو بڑھائیں گے خطابات

بڑھتی ہے کہیں شمع سے مہتاب کی تنویر

فاخر کے ترانے نہیں محتاجِ گلستاں

نالے نہیں بیدار کے پابندِ بم و زیر

بیدار کے مضموں سے ہے گلشن کی فضا گرم
اس کی نگہ تیز ہے تاروں سے بغلگیر

بیدار ہے وہ واقفِ اسرارِ معانی
جو شعر ہے اس کا وہ حقائق کی ہے تصویر

بیدار کے اشعار میں وہ بات ہے پنہاں
جو زہر کو تریاق کرے خاک کو اکسیر

سرکار نے پھر تاجورِ ملکِ سخن کو
کیا سوچ کے بخشا ہے یہ اعزاز "یہ توقیر"

یہ عقدۂ سربستہ تھا ادراک کے آگے
حل کر نہ سکا جس کو مرا ناخنِ تدبیر

اِس فکر میں میرا دلِ آزاد تھا پابند
ادراک کی پرواز تھی پابستۂ زنجیر

اک دوست نے اس راز کو افشا کیا آخر

پل بھر میں کُھلی مُجھ پہ مری فہم کی تقصیر

اعزازِ دکا دیز دیا ہے یہ جنہوں نے

شمس العلماء کی انہیں مقصود تھی توقیر

اشعار

مانندِ لالہ بہ خیاباں دمیدہ باش

یا مثلِ تیغِ تیز بہ میداں کشیدہ باش

یا مثلِ آہِ سینۂ سوزاں بلند شو

یا ہمچو اشکِ جانِ حزینے چکیدہ باش

بُلبل مثالِ دردِ دلِ من نشیں بہ گل

یا از چمن چو رنگِ رُخِ من پریدہ باش

اشعار

اب کے تو رنگ و بُو کا تماشا ہی اور ہے
یُوں اپنا شوق سلسلہ جنباں نہ تھا کبھی

پھُولوں کو دیکھتی ہیں نگاہیں کچھ اس طرح
جیسے ہیں آشنائے بہاراں نہ تھا کبھی

وُہ دن بھی تھے کہ شوق کی دُنیا تھی اور ہم
شیرازۂ خیال پریشاں نہ تھا کبھی

انسانیت خود اپنی نگاہوں میں ہے ذلیل

اتنی بلندیوں پہ تو انساں نہ تھا کبھی

○

خوابیدہ مری روح میں اے نغمۂ خاموش

تو دیکھ کہ میں گوش بر آوازہ ہوں کب سے

تاروں کے دریچوں سے مجھے جھانکنے والے

تھامے ہوئے میں دل میں ترا راز ہوں کب سے

○

مرا نصیب کہ منزل کو پاؤں اُٹھ نہ سکے

دیارِ دوست کے نزدیک جا کے لوٹ آیا

نہ پوچھ میرے دلِ مضطرب پہ کیا گزری

تری نظر سے نظر جب ملا کے لوٹ آیا

خزاں کے تُند بگولے چمن میں آہی گئے
کلی کے دل میں تمنّا تھی مُسکرانے کی

○

نظر میں کیفیتِ درد و یاس رہتی ہے
ترے بغیر طبیعت اُداس رہتی ہے
خبر نہیں ہے تمنّا کا یہ مقام ہے کیا
کہ تجھ سے ملنے کی ہر لحظہ آس رہتی ہے

○

وقت ہے صبا رفتار اس کے ساتھ کیا چلنا
تم ذرا ٹھہر جاؤ وقت کو گزرنے دو
منتظر جو رستے میں موت ہے تو پھر کیا ہے
اس میں ہرج ہی کیا ہے زیست کو سنورنے دو

ہے یاد مجھے دورِ حسینوں کی تو بس اِتنی
عالم تھا مرے دل پہ مگر بے خبری کا

○

پردے دل و نگاہ پہ ہیں حُسن پہ نہیں
اپنے دِل و نگاہ سے پردے اُٹھا کے دیکھ

○

کارواں سے اِس طرح بچھڑے کہ تا حدِّ نظر
اب کہیں ہم کو نشانِ کارواں مِلتا نہیں

شکنتلا

ریل گاڑی رُک چلی ہے دھرم پور آنے کو ہے

ساغرِ لبریز آنکھوں کا چھلک جانے کو ہے

سلسلہ نانا ونی کا ہے منظر کے سامنے

پھر وُہی تصویر کھینچی ہے سکوتِ شام نے

دیکھ لے اک بار پھر اسے دیدۂ خوننابہ بار

سامنے ہے زندگی کی آرزوؤں کا مزار

کیا خبر کس کیفیت میں گم ہُوا جاتا ہوں میں

ایک طوفاں ہے کہ جس میں ڈوبتا جاتا ہوں میں

خامشی سے نالہ کش ہے خاطرِ اندوہ گیں

روح میں دھڑکن سی ہے جذبات پر قابو نہیں

نطق کو حاصل کہاں تابِ بیانِ زندگی

بہہ گئے آنسو چھلک کر داستانِ زندگی

اے پہاڑو اے گھٹاؤ! مجھ کو شکوہ تم سے ہے

اے سکوں پرور ہواؤ مجھ کو شکوہ تم سے ہے

اے کسولی کے دل آرا کوہسارو کیا کیا

بادلوں کے اے جنوں پرور نظارو! کیا کیا

ہر طرف اُتری ہوئی دلکش بہارو! کیا کیا

جنّتِ چشم تماشا سبزہ زارو! کیا کیا

تم نے مل جل کر کسی کی نوجوانی چھین لی

ایک بیکس کی بہارِ زندگانی چھین لی

میری راحت اور میری شادمانی لوٹ لی
لُوٹ لی میری متاعِ زندگانی لوٹ لی

پیپل کے اے خوشنما اُونچے درختو! دیکھ لو
دُور تک پھیلے ہُوئے پھُولوں کے تختو! دیکھ لو

میں نے کھایا ہے تمہاری دلربائی کا فریب
رنگ و بُو کا، تازگی کا، جانفزائی کا فریب

میں تو سمجھا تھا کہ مجھ پر رحم فرماؤ گے تم
اک فقیرِ بے نوا کو فیض پہنچاؤ گے تم

میں تو سمجھا تھا جسے لے کر یہاں آیا ہُوں میں
موت کی یورش سے اب اُس کو چھڑا لایا ہُوں میں

میں تو سمجھا تھا یہاں آکر وُہ راحت پائے گی
اور اُس کو یہ فضائے دل نشیں راس آئے گی

میں تو سمجھا تھا مقدّر یاوری فرمائے گا

میری اُمیدوں کا سرمایہ نہ لٹنے پائے گا

کیا خبر تھی کامرانی آرزو سے دُور ہے

اور میری خوش نصیبی تم کو نا منظور ہے

اے درختو! میں تو سمجھا تھا کہ تم جھومو گے جب

ایک مرجھائی ہوئی پتّی کا مُنہ چُومو گے جب

وہ تمہارے لمس سے اک شادمانی پائے گی

شادمانی سے سرودِ زندگانی پائے گی

جب تمہارے سائے میں آرام فرمائے گی وہ

زندگانی کی نویدِ جانفزا پائے گی وہ

مجھ کو کیا معلوم تھا تم درد سے بیگانہ ہو

اپنی ہی دُنیا میں ہو گُم درد سے بے گانہ ہو

کیا خبر تھی تم پہ آہوں کا اثر ہوتا نہیں

اور غم دیدہ نگاہوں کا اثر ہوتا نہیں

چند گھڑیوں کے لئے جس پر تمہارا سایہ تھا

ہاں کسی برگشتہ قسمت کا وہی سرمایہ تھا

میں رفیقِ زندگی کو اس جگہ لایا تھا جب

اک مجسّم درد کی صورت یہاں آیا تھا جب

جب مری ہر سانس اک ٹوٹی ہوئی فریاد تھی

جب گرفتارِ مصائب فطرتِ آزاد تھی

رُوبرو آنکھوں کے جب اُمید بھی تھی یاس بھی

کارفرما نا اُمیدی بھی تھی اور تھی آس بھی

ہمتّیں باقی تھیں اپنے حوصلے ٹوٹے نہ تھے

آبلے تھے پاؤں میں لیکن ابھی پھُوٹے نہ تھے

التجا کی تھی کہ اے نیناوتی کے کوہسار

ملتجی ہوں میں ترے آگے بچشمِ اشکبار

جانفزا موسم سے یوں ارشاد فرما دے ذرا

اک مریضِ خستہ جاں کو فیض پہنچا دے ذرا

تو نے میری التجاؤں کی ذرا پروا نہ کی

درد میں ڈوبی دعاؤں کی ذرا پروا نہ کی

میرے آنسو پتھروں پہ رائیگاں گرتے رہے

بن کے پیہم داستاں در داستاں گرتے رہے

میں اسے لے کر خدا جانے کہاں پھرتا رہا

پتھروں پہ ڈگمگاتا جابجا گرتا رہا

مجھ کو ہر تکلیف میں ہر رنج میں آرام تھا

دل میں دردِ دوست تھا لب پہ خدا کا نام تھا

کون کر سکتا ہے لیکن اے اجل! تیرا علاج

جب نہ منظورِ مقدّر ہو تو پھر کیسا علاج

چاند تارو! یہ سماں کتنا الم آثار تھا

میری قسمت سو رہی تھی اور میں بیدار تھا

اے گرفتارِ تپِ کہنہ! قرارِ چشم و دِل

ایک مدّت تک رہی ہے تو علیل و مضمحل

ایک مدّت تک تجھے درد و الم سہنا پڑا

دُور گھر سے ہسپتالوں میں تجھے رہنا پڑا

تجھ کو ہر بد ذائقہ کڑوی دوا پینی پڑی

مدّتوں بینی پڑی بے مدّعا پینی پڑی

پھیپھڑے پر وُہ ترے جرّاح کے نشتر کی ضرب

یاد سے اس کی مرے احساس میں ہے درد و کرب

شکر ہے آخر حوادث کا یہ بادل چھٹ گیا

شکر ہے آخر ترا دورِ مصائب کٹ گیا

سامنے میرے دعاؤں کا مری انجام ہے

اب ترے ہر دردِ ہر تکلیف کو آرام ہے

اب نہ روئے گی تو اپنی بچیوں کو دیکھ کر

اور اُس معصوم کی خاطر نہ ترسے گی نظر

جو ترے دامن میں آیا مسکرایا چل بسا

جس کو یہ اندازِ دُنیا کا نہ بھایا، چل بسا

اب نہ ہم کڑوے دوا دارو پلائیں گے تجھے

اب نہ بیماروں کے بستر پر سُلائیں گے تجھے

اے کہ گھبراتی تھی تو کڑوی دوا کے نام سے

آگ کے شعلوں میں جا سوئی ہے کس آرام سے

آسماں تک شعلے پہنچے اور تُو نے اُف نہ کی

کس قدر حیران کن ہے ارتقائے زندگی

عالمِ فردوس میں تو آج آرامیدہ ہے

میرے سینے میں تری یادِ حسیں خوابیدہ ہے

روح باقی جا چکی ہے جسمِ فانی جل چکا

آج وہ میرا جہانِ شادمانی جل چکا

ہائے کیا نقشہ دکھایا گردشِ ایّام نے

تو نہیں ہے اور ہیں تیرے پُھول میرے سامنے

چُن کے تیری راکھ سے یہ پُھول لے آیا ہوں میں

گوہرِ اشکِ رواں دے کر انھیں لایا ہوں میں

بزمِ فانی کی کثافت سے نہ آلودہ رہیں

پُھول تیرے دامنِ گنگا میں آسودہ رہیں

ایک آرزو

اے شریکِ سوز و راحت! زندگانی کی رفیق

چارہ سازِ درد، میری شادمانی کی رفیق

میری آنکھوں کو ابھی تک وہ سماں بھولا نہیں

جب گرفتارِ گلو تھی تیری آوازِ حزیں

جب تری گفتار اک بھولا ہُوا افسانہ تھا

ساز تھا لیکن حسیں آواز سے بیگانہ تھا

جب تری نبضیں مری اُنگلی تلے آتی نہ تھیں

جب تری سانسیں تری دُنیا کو گرماتی نہ تھیں

آسمانوں تک دعائیں میری جا سکتی نہ تھیں

تختِ اعظم کا کوئی پایہ ہلا سکتی نہ تھیں

نطق کی محتاج تھی جب میری فریادِ خموش

سوچنے کا عقل کو دل کو نہ تھا رونے کا ہوش

نیم شب کو جب اجل تیرے سرہانے آ گئی

جسم ٹھنڈا ہو گیا تیرا، نظر پتھرا گئی

دیکھتے ہی دیکھتے جب ہو گئی خاموش تو

میں نے دیکھا پھول باقی ہے مگر بے رنگ و بو

آج شاید تو مکان و لامکاں سے دُور ہے

اس زمیں سے دور ہے اِس آسماں سے دُور ہے

چاند تاروں سے پرے ہے کہکشاں سے دُور ہے

عقل سے ادراک سے وہم و گماں سے دُور ہے

حلقۂ روز و شب و شام و سحر سے دُور ہے

تُو جہاں بھی ہے مری حدِّ نظر سے دُور ہے

کیا خبر مسکن ہے تیرا آج کل کس دیس میں

کون سے خوابوں کی دنیا میں ہے کیسے بھیس میں

کیا خبر اُس دیس کا کیا حال ہے کیا رنگ ہے

رہنے سہنے بات کرنے کا وہاں کیا ڈھنگ ہے

کاش مجھ کو تیری دنیا کا پتا دیتا کوئی

تُو کہاں ہے مجھ کو اِتنا ہی بتا دیتا کوئی

میں تو اتنا جانتا ہوں اے قرارِ چشم و دل

اے مری حدِّ نظر! اے انتظارِ چشم و دل

جب چتا کی لکڑیوں پر سو گیا تیرا شباب

"کچھ نظر آیا نہ جز یک شعلۂ پر پیچ و تاب

شمع تک ہی میں نے یہ دیکھا کہ پروانہ گیا"

دُور تک گو جستجو میں شوقِ دیوانہ گیا

تو کہاں ہے اے مرے گلزارِ ہستی کی بہار

قسمتِ بیدار ہر دردِ نہاں کی چارہ کار

کیا صبا بن کر کسی گلشن میں آوارہ ہے تُو

یا بسیرا کر لیا پھولوں کے دل میں مثلِ بُو

یا فلک پر ہے کسی تارے کی تابانی میں گُم ؟

یا مرے افکارِ روشن کی درخشانی میں گم

مائلِ آرام تو مہتاب کے ایواں میں ہے ؟

یا کہیں آسودہ میرے خاطرِ ویراں میں ہے ؟

ہ میر کے شعر میں ہلکا سا تصرف کیا گیا ہے

تیرے دل کو بھا گئی ہے کوئی خوابوں کی زمیں

یا پسند آئی ہے آوارہ سحابوں کی زمیں

ہو گئی تو آبشاروں کے ترنّم میں مکیں؟

یا ٹھکانا کر لیا آوازِ بلبل میں کہیں؟

جس کو تو محبوب تھی تو اُس فضا میں تو نہیں؟

تو پہاڑوں کی جبینوں پر دھری ہوا میں تو نہیں

دور اُفق کی منزلوں سے بھی کہیں تیرا ہے گھر؟

یا ہے تو خورشید کی پہلی کرن میں جلوہ گر

دیدۂ آہو میں ہے تو، یا رمِ آہو میں ہے؟

کچھ بتا دے پھول میں یا پھول کی خوشبو میں ہے

برگِ گُل پر قطرۂ شبنم کی بیتابی میں ہے؟

یا مرے سوکھے ہوئے آنسو کی نایابی میں ہے؟

آبِ گوہر میں ہے دریا کی روانی میں ہے تُو

یا مرے ٹوٹے ہوئے دل کی کہانی میں ہے تُو

تتلیوں کے خوش نما رنگوں میں آرامیدہ ہے

وقت کی پرواز کے دامن میں یا خوابیدہ ہے

جنّتِ گم گشتہ! پوشیدہ تر از کیفِ بہار!

جستجو میں تھک گئی ہے میری چشمِ انتظار

اے کہ تجھ کو ڈھونڈتی ہے میری جانِ دردمند

اے کہ اِک پل کی جدائی بھی نہ تھی تجھ کو پسند

ہو سکے تو میری خلوت گاہ میں پھر آ کبھی

خاطرِ اندوہگیں کو شادماں فرما کبھی

فریبِ منظر

سمجھ میں آ نہ سکا یہ طلسمِ مرگ و حیات
ہمیشہ راز رہا عقل پر فنا و ثبات
خرد اگرچہ رہی اس کی جستجو میں مدام
مگر نہ کھول سکی عقدۂ حیات و ممات

طواف کر کے نگاہِ عمیق لوٹ آئی

عجیب گنبدِ بے در ہے جلوہ گاہِ صفات

فریب ہے کہ حقیقت حیات کیا شے ہے

کھلا نہ رازِ فنا کیا ثبات کیا شے ہے

فضا نے رنگ جو بدلا تو نو بہار آئی

نسیمِ صبح چمن زار کو نکھار آئی

ہر ایک کنجِ دلآویز میں ہوائے بہار

ہر ایک پتّی کو ہر پھول کو سنوار آئی

فلک پہ ابر جو اٹھا تو کیف بار اٹھا

صبا چمن میں جو آئی تو عطر بار آئی

کہ آ کے تند بگولوں نے یہ سماں بدلا

فضا میں خاک اڑی رنگِ آسماں بدلا

خبر نہیں ترے جانے کا مدعا کیا ہے

سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ ماجرا کیا ہے

مجھے کچھ اپنی خطا کا پتہ نہیں چلتا

سزا جو مجھ کو ملی ہے مری خطا کیا ہے

خیال اپنی امنگوں میں شادماں تھا مگر

خبر نہ تھی کہ امنگوں کی انتہا کیا ہے

مۓ نشاط کا ہاتھوں سے جام چھوٹ گیا

کھلی جو آنکھ تو سارا طلسم ٹوٹ گیا

کسی بھی گُل کا تبسّم نہیں بقا کے لیٔے

ہر ایک ذرّہ ناچیز ہے فنا کے لیٔے

دل و نظر کی پریشانیوں کا حال نہ پُوچھ

کہ اب تو ہاتھ بھی اُٹھتے نہیں دُعا کے لیٔے

ذرا بھی ہے جو تجھے میری آرزو کا خیال

تو ایک بار نظر آ مجھے خدا کے لئے

تو جس فضا میں بھی ہے اُس فضا کو چھوڑ کے آ

طلسمِ مہر و سپہر و ستارہ توڑ کے آ

تجھے خبر بھی ہے تجھ کو بُلا رہا ہے کوئی

رہینِ خوابِ فنا کو جگا رہا ہے کوئی

کبھی بہ نطق و تکلّم، کبھی خموشی سے

فسانۂ غمِ ہستی سُنا رہا ہے کوئی

قدم قدم پہ یہ احساس ہے کہ تنہا ہوں

قدم قدم پہ مجھے یاد آ رہا ہے کوئی

"رواقِ منظرِ چشمِ من آشیانۂ تُست

کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تُست"

استفسار

دیدہ و دل کی مکیں میری تمنّائے نشاط
آرزو کی منزلِ مقصود دُنیائے نشاط

سال تجھ کو ہوگیا دُنیا سے مُنہ موڑے ہوئے
مجھ سے اپنا رشتۂ مہر و وفا توڑے ہوئے

دل نے اب تک اپنے دامن میں بسایا ہے تجھے
درد نے خاموش نالوں سے بُلایا ہے تجھے

اے کہ ہے احساس کی گہرائی میں تیرا مقام
آج پھر جذبات کی دُنیا ہے تجھ سے ہمکلام
گرچہ مبہم ہے مگر پھر بھی یہ حرفِ راز سُن
تو جہاں بھی جس طرح بھی ہے مری آواز سُن
جب فریبِ رنگ و بُو سے تو جُدا ہو کر چلی
اس جہانِ زندگانی سے خفا ہو کر چلی
خارزاروں سے ہُوا یا لالہ زاروں سے گذر
تھا خزاں سے یا ترا رنگیں بہاروں سے گذر
کیا نئی دُنیا نئے انساں تھے تیرے منتظر
دل کشی کے کیا نئے ساماں تھے تیرے منتظر
یا جہاں پہنچی وہاں تیرے سوا کچھ بھی نہ تھا
تیری دنیا میں بجز نامِ خدا کچھ بھی نہ تھا

آگ کی منزل پہ تو میں خود تجھے پہنچا گیا

اس کے آگے کچھ نہ دیکھا میں نے شعلوں کے سوا

اے کہ تیری یاد میں ہے دل کی دنیا سوگوار

پوچھنا یہ چاہتا ہے میرا شوقِ بیقرار

آگ کے شعلوں سے جب گذری تو کیا درپیش تھا

روبرو تیرے کوئی بیگانہ تھا یا خویش تھا

کیا تجھے کچھ درد یا تکلیف کا احساس تھا؟

کچھ تجھے معلوم بھی ہے کون تیرے پاس تھا؟

تو کہاں ہے اے مرے خاموش نالوں کی مکیں

ڈھونڈتی پھرتی ہے تجھ کو میری دنیائے حزیں

آج بھی تیرا تصور روح کی دنیا میں ہے

یہ نہیں کھلتا کہ تو خود کون سی دنیا میں ہے

تو ہے جس دُنیا میں وہ بھی اس طرح دُنیا ہے کیا

یعنی انساں کی وہاں بھی آرزو رُسوا ہے کیا

مرنے والی! وہ جہاں بھی ہے جہانِ سنگ و خشت

کیا وہاں بھی زندگانی ہے اسیرِ خوب و زشت

کیا وہاں بھی ہے بشر تاروں کی گردش میں اسیر؟

یا ہے کوکب زندگانی کا ازل سے مستنیر؟

وہ بھی کیا اس کی طرح ہے اک جہانِ خیر و شر؟

یا وہاں کی زندگی ہے خیر و شر سے بے خبر

کیا وہاں بھی زندگی کا ہے یونہی انجام موت

پھینک دیتی ہے وہاں بھی ہر خوشی پر دام موت؟

طائرِ دل کی اور صیّادوں کی دُنیا وہ بھی ہے؟

شورِ جیحوں اور فریادوں کی دُنیا وہ بھی ہے؟

کیا بشر اُس دیس میں بھی بیکس و مجبور ہے؟
کیا وہاں بھی زندگانی کا یہی دستور ہے؟

کیا وہاں بھی رُوحِ انساں درد سے آباد ہے
فکرِ انساں پا بہ گِل ہے زندگی ناشاد ہے؟

کیا وہاں بھی نالہ و فریاد سے کہرام ہے
کیا وہاں بھی آدمی ناکام ہی ناکام ہے؟

کیا وہاں بھی زد پہ ہے تدبیر پر تقدیر کا
وہ جہاں بھی ہے یونہی پابند اسی زنجیر کا؟

ولولے اُس دیس میں بھی کیا شکست انجام ہیں
واں بھی کیا طائر امنگوں کے اسیرِ دام ہیں

کیا وہاں بھی ہے عزیز و اقربا کا درد و غم
کیا وہاں بھی بے نیازِ صبح ہے شامِ الم؟

یا وہاں کچھ زندگی کا اور ہی دستور ہے
اور اس دنیا کی جو تلخی ہے نامنظور ہے

کیا وہاں راحت ہی راحت کے سوا کچھ بھی نہیں
نغمۂ عیش و مسرّت کے سوا کچھ بھی نہیں؟

زندگی کی دوپہر پر موت کا سایہ نہیں
سرخوشی کو اپنے مٹنے کا خیال آیا نہیں؟

ہر طرف لہرا رہی ہے ایک موجِ انبساط
صبح صبحِ عیش ہے ہر شام ہے شامِ نشاط؟

کیا وہاں انسان درد و رنج سے بیگانہ ہے
بے خبر شامِ الم سے صبح کا افسانہ ہے؟

کیا وہاں دردِ تمنّا روح میں چبھتا نہیں
فکرِ انسانی وہاں ہوتا نہیں اندوہگیں؟

کیا وہاں اُٹھتی نہیں ہے گریۂ غم کی صدا

کیا وہاں پیدا نہیں ہوتی ہے ماتم کی صدا؟

کیا وہاں کے لالہ زاروں پر خزاں آتی نہیں

پتّے پتّے پر وہ اپنا جال پھیلاتی نہیں؟

کیا وہاں ناکامیوں سے آشنا دُنیا نہیں

عقل و دل کی خامیوں سے آشنا دنیا نہیں؟

دام کیا باغوں میں ہمرنگِ زمیں ہوتے نہیں

کیا شکاری گوشے گوشے میں مکیں ہوتے نہیں؟

کیا وہاں ہر طائرِ رنگیں نوا آزاد ہے

بے نیازِ دام ہے ہر طرح سے دل شاد ہے

کیا وہاں دام و قفس کی زندگی ناپید ہے

کیا وہاں اس طرح کی شرمندگی ناپید ہے

کیا مقدّر ہے بشر کا مستی و کیف و نشاط

جلوہ گر اس دیس میں ہے کیا سرور و انبساط؟

کیا کروں میں راز یہ ادراک پر کھلتا نہیں

سِرّ افلاکی ہے شاید، خاک پر کھلتا نہیں

میں تو اس دنیا میں ہوں دُنیا کی ظلمت میں اسیر

ایک تیری یاد کا کوکب ہے دل میں مستنیر

تو خدا جانے کہاں ہے اور کس عالم میں ہے

میں ہوں جس دنیا میں لیکن وہ سراپا غم میں ہے

یادگاریں تو نے چھوڑی ہیں جو دو میرے لئے

گرچہ قندیلیں ہیں دو دُہ میری دُنیا کے لئے

یہ بتا میں اُن کو لیکن مطمئن کیوں کر کروں

چھیڑتی ہیں جب وُہ تیرا ذکر ان سے کیا کہوں

جو بڑی ہے وہ تو میری مان بھی جاتی ہے کچھ

اُس پہ جو گزری ہے آفت جان بھی جاتی ہے کچھ

آہ چھوٹی ہے جو لیکن اُس کو سمجھائے تو کون

تو نہ واپس آسکے گی اُس کو بتلائے تو کون

جاں ہے ننھی سی مگر کس کرب سے لبریز ہے

نو دمیدہ اُس کا یہ احساس کتنا تیز ہے

پوچھتی ہے مجھ سے اکثر "کنتلا کب آئے گی"

"اور جب آئے گی تو میرے لئے کیا لائے گی"

"پھر کسولی کی طرف تنہا اُسے بھیجا ہے کیوں"

اور میں سر در گریباں ہوں کہ اس سے کیا کہوں

جب سراپا ایک استفسار بن جاتی ہے وہ

تو سمجھتی ہے فقط باتوں سے مَن جاتی ہے وہ

اس کے ننھے سے ہے دل میں کیا خبر کیا اضطراب

مجھ سے لیکن بن نہیں پڑتا کوئی اُس کا جواب

رُوح میں چُبھتا ہُوا کانٹا ہے اس کی بات بات

ہائے اک معصوم کے ننھے سے دل کے واردات

کسولی

کسولی! میری اُمیدوں کی دُنیا لوٹنے والی

کسولی! کوہِ غم کی طرح مجھ پہ ٹُوٹنے والی

زمانے بھر کے سیّاحوں کو راحت بخشنے والی

مجھے لیکن شکستِ انجامِ محنت بخشنے والی

گلہ ہے مجھ کو تجھ سے اور تیری دلربائی سے

ترے اشجار کی جاں پروری سے جانفزائی سے

جنوں پرور فضاؤں سے سکوں پرور ہواؤں سے

ترے پھولوں کی رعنائی سے متوالی گھٹاؤں سے

گلہ ہے مجھ کو تیرے چیل کے اونچے درختوں سے

قریب و دُور تک پھیلے ہوئے پھولوں کے تختوں سے

ترے پہلو میں ہیں جو خیمہ زن اُن نوبہاروں سے

جو عقل و دل کو دیوانہ بنا دیں اُن نظاروں سے

فضاؤں میں جو ہیں محوِ خرام اُن ابر پاروں سے

ہے روشن جن سے تیری انجمن اُن چاند تاروں سے

جنہیں دعویٰ مسیحائی کا ہے اُن لالہ زاروں سے

خرامِ ناز سے گرتی ہوئی ہلکی پھواروں سے

تری دُنیا کو کہہ دیتی ہے فردوسِ نظر دُنیا

نہ جانے کس قدر ہے کم سواد و بے بصر دُنیا

ترے حق میں کسولی اس طرح گویا زمانہ ہے

خدا جانے یہ اظہارِ حقیقت یا فسانہ ہے

کہ تجھ کو بن پلائے مست کر دینے کا دعویٰ ہے

دل و دیں سے خراجِ دل کشی لینے کا دعویٰ ہے

مگر افسوس میرا تجربہ کچھ اور ہی نکلا

جو سنتا تھا نرالا اس سے نرالا طور ہی نکلا

مجھے کب ان تری دل کش فضاؤں میں قرار آیا

کہ ہر جھونکا صبا کا مثلِ تیغِ آبدار آیا

کسولی وہ الم پرور زمانہ یاد ہے تجھ کو

مری پیہم شکستوں کا فسانہ یاد ہے تجھ کو

جب آیا تھا یہاں میں اس فضا کا آسرا لیکر

گھٹاؤں کا، نسیمِ دل کشا کا آسرا لے کر

گھنی جیلیوں کا سروِ یاسمن کا آسرا لے کر
چمن کا اور چمن کے بانکپن کا آسرا لے کر

گلستاں کی بہارِ جانفزا کا آسرا لے کر
جو فرحت بخشتی ہے اس ہوا کا آسرا لے کر

میں آیا تھا کہ شاید تو مجھے دل شاد کر دے گی
مرے دامن کو گلہائے طرب آگیں سے بھر دے گی

میں اپنے گھر سے جب نکلا تھا تیری آرزو لے کر
نظر میں ایک پیہم اضطرابِ جستجو لے کر

میں اک بیمارِ جانِ ناتواں کو ساتھ لایا تھا
اُمید و یاس کے، اک کارواں کو ساتھ لایا تھا

ترے گھر میں اُمید و یاس کا وہ کارواں ٹھہرا
گِلہ میں کیا کروں تجھ سے کہ آخر امتحاں ٹھہرا

تری اِس گُزمیں کو چھیننا جس کا پسند آیا
وہی ہمسایہ تھا میری تمنّاؤں کا سرمایہ

کسولی! کیا عجیب آخر صلہ مجھ کو دیا تو نے
تجھے احساس تک اس کا نہیں ہے کیا کیا تو نے

بڑی حیرت ہے مجھ کو تیری شانِ بے نیازی پر
تری ہمدردیوں پر اور کمالِ چارہ سازی پر

ترے خوش رنگ و دلکش پھول اب بھی مسکراتے ہیں
ترے گلبن ترے اشجار اب بھی لہلہاتے ہیں

بلندی پر تری کالی گھٹائیں اب بھی آتی ہیں
جنوں پرور نشہ لے کر ہوائیں اب بھی آتی ہیں

مجھے حیرت سی ہے تیری چمن آرا اداؤں پر
تری کالی گھٹاؤں پر جنوں پرور ہواؤں پر

فروکش تیرے گلزاروں میں ہوتی ہے بہار اب بھی

بہاروں میں ترے پھولوں پہ آتا ہے نکھار اب بھی

ترے کہسار جب کالی گھٹا میں ڈوب جاتے ہیں

سُنا ہے میں نے لوگوں سے وہی منظر دکھاتے ہیں

گھٹائیں جب نشے میں مست ہو کر جھوم جاتی ہیں

تو اب بھی وہ تری گہرائیوں کو چوم جاتی ہیں

اُترتا ہے زمیں پر ابرِ مستانہ بدوش اب بھی

بنا دیتا ہے ذرّے ذرّے کو وُہ بادہ نوش اب بھی

سُنا اور بادلوں میں آج بھی رُوپوش ہوتا ہے

کوئی جیسے شرابِ کیف سے مدہوش ہوتا ہے

اُترتا ہے بلندی سے اگر گہرائی میں "یارا"

تو اب بھی اُس کی ہوتی ہے روانی ایک نظارا

سُنا ہے خاک سے بادل اگر رفعت پہ چڑھتے ہیں

قدم لینے کو اُن کے دیدہ و دل اب بھی بڑھتے ہیں

مگر میں ہوں کہ اطمینان مجھ کو مل نہیں سکتا

مرے دل کا کنول تیری فضا میں کِھل نہیں سکتا

ترے ماحول میں اک برہمی محسوس کرتا ہوں

کہ ہر شے میں کسی شے کی کمی محسوس کرتا ہوں

گُم شُدگی

رہِ سفر میں ہمسفر! یہ کیا مقام آگیا
تڑپ اُٹھی اُمید، حوصلہ شکست کھا گیا
خبر نہیں تری نگاہ میں یہ کیا سما گیا

خرد جہانِ انتشار میں اُلجھ کے رہ گئی
نظر طلب کے خارزار میں اُلجھ کے رہ گئی
کبھی خزاں کبھی بہار میں اُلجھ کے رہ گئی

کچھ اُس مقام کا پتہ نہ چل سکا جہاں ہے تو
جو ابتدا میں ختم ہو گئی وہ داستاں ہے تو
خبر نہیں کہاں ہے تو خبر نہیں کہاں ہے تو

ترا نشاں نہ مل سکا فضائے قرب دُور میں
ستارۂ اُمید کھو گیا ہجومِ نُور میں
چمک کرن کی غرق ہو گئی ضیائے طُور میں

○

ظلمتِ یاس جب افکار میں لہراتی ہے
ایک ڈوبے ہوئے مہتاب کی یاد آتی ہے
مجھ سے اُس وقت کی کیفیتِ احساس نہ پُوچھ
ایک بجلی سی تخیّل میں تڑپ جاتی ہے

غزل

قرنوں سے بچھڑے تھے جو انساں آج وہ باہم ایک ہوئے
وقت نے ایسی کروٹ بدلی پورب پچھم ایک ہوئے

کس کا فیض ہے؟ لڑنے والے آج لڑائی بھول گئے
ایک ہوئی دونوں کی مسرّت دونوں کے غم ایک ہوئے

بس اتنی روداد سنی ہے روٹھ کے منے والوں کی
آگ بھرے دل سے اُٹھے یا دیدۂ پُرنم ایک ہوئے

انسانوں کو بانٹنے والو چال تم اپنی ہار گئے

دل کے ارادے یہ کہتے ہیں بٹ کر بھی ہم ایک ہوئے

رنگ الگ تھے تیور اور تھے اپنی اپنی رفعت تھی

ایک بلندی پر جب پہنچے سارے پرچم ایک ہوئے

رُباعی

احساس میں لَو دمک رہی ہے گویا

پیمانے سے مے چھلک رہی ہے گویا

آنکھیں ہیں کہ ہر لحظہ جھپک جاتی ہیں

شبنم پہ کرن تھرک رہی ہے گویا

وطن میں آخری رات

ہر طرف ایک پُراسرار خموشی ہے محیط

نہ وہ بیباک سا ٹھہراؤ نہ بدمست خرام

ہو گئے کون سی راتوں کا طرب ناک نصیب

وہ چمکتے ہوئے سکّے وہ کھنکتے ہوئے جام

اِس سے پہلے بھی کئی بار یہاں آیا ہوں

حُسن نے منزلِ عشرت میں اُتارا ہے مجھے

منتظر جھومتی باہوں کا اشارہ پا کر

ذرّے ذرّے نے بہر گام پُکارا ہے مجھے

نغمہ آباد میں یہ شہرِ خموشاں کا سکوت

زندگانی پہ عجب موت نے ڈالا سایہ

کان میں دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

مجھ کو اے جذبۂ مشتاق کہاں لے آیا

نہ سہی حاصلِ ہر شوق یہ دُنیا لیکن
اپنے سائے سے کبھی آپ ہراساں تو نہ تھی
خوف سے سینۂ احساس دھڑکتا تو نہ تھا
زندگی آپ ہی جلووں سے گریزاں تو نہ تھی

آج یہ لرزہ بر اندام اُجالا لیکن
آپ ہی آپ سمٹتا سا چلا جاتا ہے
کوئی برچھی کوئی خنجر کوئی پتھر کوئی اینٹ
مرے احساس کو ماحول سے خوف آتا ہے

قہقہے کتنے ترے سامنے دم سادھ گئے
اپنے اطوار ذرا دیکھ حکومت کی ہوس!
کتنی ہنستی ہُوئی گلیاں تھیں کہ ویران ہُوئیں
یُوں ترے شور سے جاگے ہیں اسیرانِ قفس

○

دوستوں کے کرم کی بات سُنا
دُشمنوں کے ستم کی بات نہ کر

غزل

بس ایک نور جھلکتا ہُوا نظر آیا

پھر اس کے بعد نہ جانے چمن پہ کیا گذری

میں کاش تم کو بھی اہلِ وطن بتا سکتا

وطن سے دُور کسی بے وطن پہ کیا گذری

جُدا جب اس سے ہوئے اہلِ کوثر و تسنیم

نہ پُوچھ عالمِ گنگ و جمن پہ کیا گذری

مرے چمن میں بھی آئی تو تھی بہار مگر

میں کیا بتاؤں کہ اہلِ چمن پہ کیا گذری

یہ راز فاش تو کر مجھ پہ اے نسیمِ سحر

یہ بات کیا ہے یہ سرو و سمن پہ کیا گذری

وُہ انجمن کہ جو کی تھی خلوص نے تعمیر

نہ پُوچھ مجھ سے کہ اُس انجمن پہ کیا گذری

خموش کیوں ہیں قتیلؔ و ندیم کچھ تو کہیں

ہمارے بعد ہمارے وطن پہ کیا گذری

سبھاش چندر بوس

بہادر شاہ ظفر کے مزار پر

السّلام اے تاجدارِ کشورِ ہندوستاں

اے شہید! اے جاں سپارِ کشورِ ہندوستاں

السّلام اے عظمتِ ہندوستاں کی یادگار

اے شہنشاہِ دیارِ دل! فقیرِ بے دیار

آج پہلی بار تیری قبر پر آیا ہوں میں

بے نوا ہوں نذر کو بے لوث دل لایا ہوں میں

سرمۂ چشمِ بصیرت ہے ترے مرقد کی دھول

اک فقیرِ بے نوا کا ہدیۂ دل ہو قبول

گردشِ تقدیر کے ہاتھوں وطن سے دُور ہوں

ایک بلبل ہوں مگر صحنِ چمن سے دُور ہوں

شوق آزادی کا مجھ کو کھینچ لایا ہے یہاں

آج دشمن ہے زمیں میری عدو ہے آسماں

میں بھی ہوں اپنے وطن سے دُور تو بھی دُور ہے

ہاں رضائے پاکِ یزداں کو یہی منظور ہے

اے شہیدِ جنگِ آزادی! شہنشاہِ وطن

میں بھی آیا ہوں یہاں باندھے ہوئے سر سے کفن

میں نے بھی تلوار اُٹھائی ہے تری تقلید میں

اور لاتعداد بازو ہیں مری تائید میں

میرا دامن بھی یہاں کی خاک سے آلودہ ہے

فرق صرف اتنا ہے میں آوارہ تو آسودہ ہے

اے شہِ خوابیدہ! اے تقدیرِ بیدارِ وطن

آئینہ میری نگاہوں پر ہے ادبارِ وطن

میرے دل کو یاد ہے اب تک وہ ستاون کی جنگ

جس کے بعد اس سرزمیں پہ چھا گئے اہلِ فرنگ

میری نظروں میں ہے میرٹھ اور دہلی کا زوال

جانتا ہوں میں جو تھا جھانسی کی رانی کا مآل

میں نہیں بھولا ابھی انجامِ ناناؔ فرنویس

ہے نظر میں کوششِ ناکام ناناؔ فرنویس

داستاں جیسے بھی ہو گزری وہ سب معلوم ہے

تیرے دلبندوں پہ جو گزری وہ سب معلوم ہے

ہاں تو اے سرمایہ دارِ عزّتِ ہندوستاں

اے کہ تو ہے یادگارِ سطوتِ ہندوستاں

خاک تیری قبر کی میری زیارت گاہ ہے

آج اسی مٹّی سے میرے دل کو رسم و راہ ہے

سرمۂ چشمِ بصیرت اے ترے مرقد کی خاک!

خاک ہے یہ سرزمینِ ہند کی مانند پاک

آج اسی مرقد پہ اپنا عزم دہراتا ہوں میں

دیس پر قربان ہونے کی قسم کھاتا ہوں میں

اے شہ ہندوستاں اے لال قلعے کے مکیں

آسماں ہونے کو ہے پھر اس وطن کی سرزمیں

یہ وطن روندا ہے جس کو مدّتوں اغیار نے

جس پہ ڈھائے ظلم لاکھوں چرخ ناہنجار نے

جس کو رکھا مدّتوں قسمت نے ذِلّت آشنا

جس نے ہر پہلو میں دیکھی پستیوں کی انتہا

آج پھر اس ملک میں اک زندگی کی لہر ہے

خاک سے افلاک تک تابندگی کی لہر ہے

آج پھر اس ملک کے لاکھوں جواں بیدار ہیں

حرّیت کی راہ میں مٹنے کو جو تیّار ہیں

آج پھر ہے بے نیام اس ملک کی شمشیر دیکھ

سونے والے جاگ اپنے خواب کی تعبیر دیکھ

اِس طرح لرزے میں ہے بنیادِ ایوانِ فرنگ

کھا چکے ہیں مات گویا شیشہ بازانِ فرنگ

حبّ قومی کے ترانوں سے ہوا لبریز ہے

اور توپوں کی دنادن سے فضا لبریز ہے

شورِ گیر و دار کا ہے پھر فضاؤں میں بلند

آج پھر ہمّت نے پھینکی ہے ستاروں پر کمند

پھر اُمنگیں آرزوئیں ہیں دلوں میں بیقرار

قوم کو یاد آگیا ہے اپنا گم گشتہ وقار

نوجوانوں کے دلوں میں سرفروشی کی اُمنگ

عشق بازی لے گیا ہے عقل ہچاری ہے دنگ

آج پھر اس دیس میں جھنکار تلواروں کی ہے

کچھ نرالی کیفیت پھر دیس کے پیاروں کی ہے

جو توانائی ارادوں میں ہے کہساروں کی ہے

ذرّے ذرّے میں تپاں تابندگی تاروں کی ہے

یہ نظارہ آہ لفظوں میں سما سکتا نہیں

"آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں"

فتح و نصرت کی دعاؤں سے ہوا معمور ہے

نعرۂ "جے ہند" سے ساری فضا معمور ہے

مُجھ کو اے شاہِ وطن! اپنے ارادوں کی قسم

جن کے سر کاٹے گئے اُن شاہزادوں کی قسم

تیرے مرقد کی مقدّس خاک کی مجھ کو قسم

میں جہاں ہوں اُس فضائے پاک کی مجھ کو قسم

اپنے بھوکے جانِ بلب بنگال کی مجھ کو قسم

حاکموں کے دست پروردہ کال کی مجھ کو قسم

لال قلعے کی، زوالِ شہرِ دہلی کی قسم

محسنِ دہلی! مآلِ شہرِ دہلی کی قسم

میں تری کھوئی ہوئی عظمت کو واپس لاؤں گا

اور ترے مرقد پہ نصرت یاب ہو کر آؤں گا

تیغِ ہندی جس کا لوہا مانتا ہے اک جہاں

جس کی تیزی کی گواہی دے رہا ہے آسماں

تیغِ ہندی جس کو میں نے کر دیا ہے بے نیام

جس کا شیوہ حریت کیشی جہانگیری ہے کام

جس نے پوری منصفی کی آج تک دُنیا کے ساتھ

ظلم کی دُشمن ہے جو اک ظلم بے پروا کے ساتھ

ہر قدم پر جس نے باطل کو ملایا خاک میں

جس کے ساکھوں کی ابھی تک گونج ہے افلاک میں

آج پھر اپنی نظر جس کی چمک سے خیرہ ہے

جس کی تابانی سے روشن اک جہانِ تیرہ ہے

اک جزیرے کے حسیں ساحل سے جب ٹکرائے گی

چین سے مجھ کو بھڑکتی آگ میں نیند آئے گی

آزاد ہند فوج

سنہ ۱۹۴۶ء

پائندہ باد ہند کی اے فوجِ خوش نہاد
وہ دن خدا کرے کہ بر آئے تری مُراد
مٹ جائے بزمِ دہر سے یہ جنگ یہ فساد
زنداں کو توڑ پھوڑ دے اے حُرّیت نژاد
اب وقت آگیا ہے کہ ہو عازمِ جہاد
ہندوستاں کی فوجِ ظفر موج زندہ باد

پرچم ترا ہو چاند ستاروں سے بھی بلند

پہنچا سکے نہ دورِ زمانہ تجھے گزند

اغیار کر سکیں نہ کبھی تجھ پہ راہ بند

پسپائیاں ہوں تیرے جوانوں کو ناپسند

تو کامراں ہو اور عدو تیرے نامراد

ہندوستاں کی فوجِ ظفر موج زندہ باد!

"جے ہند" کی صداؤں میں تیرے جواں بڑھیں

ہاتھوں میں لے کے امن و اماں کا نشاں بڑھیں

نصرت نصیب اُن کے قدم ہوں جہاں بڑھیں

بہرِ وقار و عظمتِ ہندوستاں بڑھیں

دنیا کو بھی وہ شاد کریں ہند کو بھی شاد

ہندوستاں کی فوجِ ظفر موج زندہ باد!

غزل

خِرد کا سفینہ جنوں کے ہیں دھارے
کبھی اِس کنارے کبھی اُس کنارے

نگاہیں تھیں اور مہوشوں کے نظارے
کچھ ایسے بھی ایّام ہم نے گذارے

محبّت کا دریا وفا کا سفینہ
یہ بےباک موجیں یہ بےتاب دھارے!

فقط اک نظر کے ہیں محتاج اے دل

یہ رنگیں شفق یہ حسیں چاند تارے

کٹھن منزلیں تھیں وفاؤں کی لیکن

میں بڑھتا گیا بے خودی کے سہارے

تری جستجو میں مری آرزو نے

بہت رنگ بدلے بہت روپ دھارے

نہ ذرّوں کو ان سے کوئی فیض پہنچا

چمکتے رہے آسماں پر ستارے

وُہ خورشید نکلا وہ خورشید نکلا

وُہ ڈوبے ستارے وہ ڈوبے ستارے

عجب شے ہے آزاد ذوقِ نظر بھی

ہُوئیں منزلیں طے اسی کے سہارے

اے دل!

رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک نظم

ہو ذوق وشوق کی منزل کا رہ سپار اے دل

جو رہ گئے ہیں، نہ کر اُن کا انتظار اے دل

ہے صبح محفلِ عالم میں جلوہ کار اے دل

فلک پہ ذکر ہوا تیرا بار بار اے دِل

شبِ سیاہ میں حاصل ہوں شبنمی گوہر

یہی ہے آرزوئے غنچہ کا کمال مگر

کمالِ آرزوئے گُل وصالِ نورِ سحر

وجودِ تیرہ سے تو بھی ہو آشکار اے دل

ہو ذوق و شوق کی منزل کا رہ سپار اے دل

جو رہ گئے ہیں نہ کر اُن کا انتظار اے دل

○

بزمِ خرد میں قدرِ جنوں کا سوال کیا

ہم آ گئے تھے چاکِ گریباں سئے بغیر

غزل

اک پیکرِ طلسم ہے دُنیا نہیں کچھُ اور
اس کے سوا نگاہِ تماشا! نہیں کچھُ اور

تیرے بغیر آ نہ سکا روح کو قرار
تیرے بغیر دل میں تمنّا نہیں کچھُ اور

جچتی نہیں چمن کی بہاریں نگاہ میں
یارب! یہ حُسن و رنگ کی دنیا نہیں کچھُ اور

روزِ ازل کہ ملنے لگی تھی یہ کائنات
کہنا یہ چاہیئے تھا کہ دُنیا نہیں کچُھ اور

ذوقِ نظر بلند ہے اب حُسن و رنگ سے
اب حُسن و رنگ دل کو گوارا نہیں کچُھ اور

ہاں ہاں نہیں ہے دل کو مداوے کی آرزو
ہاں ہاں دلِ حزیں کا مداوا نہیں کچُھ اور

دُنیا میں خونِ آرزوئے دل کے ماسوا
آزاد کی نگاہ نے دیکھا نہیں کچھ اور

سفر میں ایک شام

اُونچے کہسار کے اُس جانب جلوؤں کا فسوں گم ہونے لگا
امن اور سکوں کے دامن میں ہنگامۂ عالم سونے لگا

دُنیا سے تجلّی جانے لگی ہر شے پر تیرگی چھانے لگی
میدانِ ظلمت کے پانی سے ہر بادل کا منہ دھونے لگا

یہ دل کش و ہیبت ناک سماں ظلمات کی یہ لہریں سی رواں
یہ دل کو مرے کیا ہونے لگا دل صبر و سکوں کیوں کھونے لگا

اے کاش یہ راز بتادے کوئی اس بھید سے پردہ اُٹھادے کوئی

یہ کون ہے جو یاد آ آکر نشتر سے دل میں چبھونے لگا

○

ہوئی ہیں بارہا اُن کی نگاہیں ملتفت لیکن

مرا دل ہے کہ اب تک حدِ فاصل یاد رکھتا ہے

یہ مانا اِک زمانہ ہو گیا بچھڑے ہُوئے لیکن

تمہیں اے بھولنے والو! مرا دل یاد رکھتا ہے

مری غربت کی شامیں ہیں تمہاری یاد سے رَوشن

تمہیں قلبِ حزیں منزل بہ منزل یاد رکھتا ہے

ایک غزل کے چند اشعار

مری خرد کا تو آوارگی شعار نہیں
خبر نہیں کہ نگاہوں کو کیوں قرار نہیں

کبھی وہ دن تھے کہ کانٹوں سے انس تھا دل کو
ہے اب یہ حال کہ پھولوں سے اس کو پیار نہیں

نہیں یہ عذر کہ ہوں نیک و بد سے ناواقف
ہوں معترف کہ ارادوں پہ اختیار نہیں

اگرچہ سوزِ نفس کا مگار ہو نہ سکا

مگر یہ کم ہے کہ منّت کشِ بہار نہیں؟

چمن کی ارضِ دلآرا کو کیا ہُوا یارب

کہ نو بہار میں وہ رنگِ نو بہار نہیں

ہر ایک پھُول نے رازِ بہار فاش کیا

بس ایک تُو ہی نگاہوں پہ آشکار نہیں

۱۹۳۶ء

چاندنی رات

چاندنی رات مسلّط ہے کہستانوں پر
دُور گہرائی میں جاتی ہوئی ڈھلوانوں پہ
عیش و آرام سے معمُور شبستانوں پر
درد ایّام سے لبریز الم خانوں پر
چاندنی رات! دلآویز ہے افسانہ ترا
بادۂ کیف سے لبریز ہے پیمانہ ترا

روشنی تجھ سے ہے آبادی میں ویرانے میں

کاخِ زردار میں مزدور کے کاشانے میں

سب کا حصّہ ہے شبِ مہ ترے پیمانے میں

سبھی مے خوار ہیں یکساں ترے میخانے میں

ترے انوار ہیں فردوسِ نظر سب کے لئے

ترے دامن میں ہیں لعل اور گہر سب کے لئے

جگمگا اُٹھا ترے فیض سے کہسارِ مری

شجرِ طور کی مانند ہیں اشجارِ مری

پیکرِ نور ہے ہر کوچہ و بازارِ مری

قابلِ دید ہے کیا رونقِ گلزارِ مری

ذرّے ذرّے سے عیاں شانِ دلآرائی ہے

اور ہر برگِ شجر پیکرِ زیبائی ہے

چاندنی شب کا پہاڑوں پہ سماں دیکھتا ہوں

خاک پر نُور کا دریا ہے رواں دیکھتا ہوں

گرچہ ہر شے کو حسیں اور جواں دیکھتا ہوں

دل کی گہرائی میں اک سوزِ نہاں دیکھتا ہوں

رفعتِ کوہ پہ ہوں فکر کہاں پھرتا ہے

پستیٔ ہند کا آنکھوں میں سماں پھرتا ہے

چاند! جب عالمِ ظلمت کو زوال آتا ہے

اور تو عرش پہ با حُسن و جمال آتا ہے

دلِ غمناک میں اکثر یہ خیال آتا ہے

جس سے اُمیّد کی دُنیا پہ ملال آتا ہے

کیا کبھی ہو گی نہ پُر نُور شب تارِ وطن ؟

اور شاداب نہ ہو گا کبھی گلزارِ وطن ؟

۱۹۳۸ء

غزل

بزمِ جہاں میں آدمی ذوقِ شعور کے سوا
آنکھ ہے نور کے سوا بادہ سرور کے سوا

دل پہ تری تجلّیاں راز یہ کر گئیں عیاں
اور بھی ہیں ترے مقام رفعتِ طور کے سوا

آنکھ کا نور ہے فضول آنکھ کے نور پر نہ بھول
اور بھی ایک نور ہے آنکھ کے نور کے سوا

قولِ حکیمِ ہند[1] سے مجھ پہ عیاں ہُوا کہ علم

ایک بہشت ہے مگر جلوۂ حُور کے سوا

اس کے رموز[2] نے کیا مجھ پہ یہ راز فاش تر

اور بھی اک کلیم ہے صاحبِ طُور کے سوا

سنہ ۱۹۳۸ء

---

[1] علم میں بھی سرور ہے لیکن — یہ وہ جنّت ہے جس میں حُور نہیں

[2] رموزِ بے خودی۔

قطعہ

۱۹۴۷ء

نصف شب کو شہر میں اک آتشیں گولہ پھٹا

شہر کے سارے اندھیرے روشنی میں کھو گئے

کیا خبر گُل ہو گئے کتنی اُمیدوں کے چراغ

کیا خبر اِس نُور میں کتنے نصیبے سو گئے

اشعار

غنچۂ دِل نہ کھِل سکا اپنا پتہ نہ مل سکا

اپنی تلاش کا مآل درد کا ایک سلسلہ

اہلِ جہاں کی بے رُخی گرچہ ہے دِل شکن مگر

عزم بلند ہو اگر سخت نہیں یہ مرحلہ

خرد سمجھ نہ سکے گی جنوں ہی سمجھے گا

تری نظر کے اشارے بدلتے رہتے ہیں

○

دُعا تو لب پہ ہے وصلِ حبیب کی لیکن

یہ ہائے ہائے کی لذّت کہاں سے لاؤں گا

ابھی کچھ اور بڑھاؤں گا داستانِ وفا

ابھی کچھ اور زمانے کو آزماؤں گا

سُنائے تو نے جو نغمے مجھے خموشی میں

زبانِ شعر میں تجھ کو وہی سُناؤں گا

○

دردِ جُدائی دینے والے اتنی بات بتاتا جا

تُو جب ہو گا دُور نظر سے درد کا درماں کیا ہو گا

یہ رازِ عقلِ عقدہ کشا پر نہ کھل سکا
جانا کہاں ہے آئے جہاں میں کہاں سے ہم

ہو خوف کیوں خزاں کا بہاروں سے پیار کیوں
واقف ہیں جب فریبِ بہار و خزاں سے ہم

منزل اگرچہ اب بھی بہت دور ہے مگر
آگے نکل گئے ہیں بہار و خزاں سے ہم

کچھ ابتدا کی ہے نہ خبر انتہا کی ہے
ایسے کٹے ہوئے ہیں کسی داستاں سے ہم

○

جو میں تھک کے دردِ تلاش سے یہ پکار اٹھا ہے کہاں کوئی
تو حریمِ روح نے دی صدا کہ یہیں کہیں ہے نہاں کوئی

موت اگر آسان نہیں ہے جینا بھی آسان نہیں

موت کو مشکل جاننے والے جینا موت سے مشکل ہے

○

پھری نگاہ بہت چمن چمن لیکن

کہیں وہ زینت فصل بہار مل نہ سکا

لارنس باغ میں ایک لمحہ

جلوہ گر مہتاب ہے افلاک پر

نُور کا دریا رواں ہے خاک پر

عالمِ امکاں پہ طاری ہے سکوت

دہر کی ہر شے میں ساری ہے سکوت

ذرّہ ذرّہ باغ کا خاموش ہے

دم بخود صر صر فضا خاموش ہے

پھول چپ غنچے ہیں، کلیاں ہیں چُپ

شاخ پر مُرغانِ خوش الحاں ہیں چپ

خار چُپ پتے ہیں چُپ اشجار چُپ

الغرض گلزار کا گلزار چُپ

ہر طرف ہے اک سکوں چھایا ہُوا

باغ ہے زیرِ فسوں آیا ہُوا

یہ فضا یہ خامشی پرور سماں

یہ تجلّی یہ سکونِ بیکراں

باغ میں پھول آسماں پر کہکشاں

کہکشاں کیا حُسن کی جوئے رواں

غنچہ و گُل کا نظارا باغ میں

حُسنِ فطرت آشکارا باغ میں

آسماں پر چاند تاروں کا سماں

آہ! نُورانی غباروں کا سماں

سبزہ زاروں میں اُلجھتی ہے نظر

نُور پاروں میں اُلجھتی ہے نظر

بادلوں میں ماہِ تاباں کا سفر

کر رہا ہے ایک جادو رُوح پر

گاہ پنہاں ہے پسِ ابرِ رواں

گاہ ظاہر بے حجاب و ضَو فشاں

چاند ہے اک پیکرِ زیبائے نُور

چاندنی بہتا ہُوا دریائے نُور

ہیں ستاروں کی نگاہیں خاک پر

میری چشمِ نُور بیں افلاک پر

چاندنی سے باغ ہے دھویا ہُوا

دل ہے اس ماحول میں کھویا ہُوا

۱۹۴۱ء

غزل

دُنیا ہے اِک محفلِ عشرت دُنیا ہے اک غم خانہ

یُوں بھی دل کا افسانہ ہے یُوں بھی دل کا افسانہ

ایک سمجھتا ہے دیوانہ کعبہ ہو یا بُت خانہ

یہ اک خلوتِ جانانہ ہے وہ اک جلوتِ جانانہ

کیونکر ہو مفقود رقابت شیخ و برہمن میں آخر

یہ بھی تیرا دیوانہ ہے وُہ بھی تیرا دیوانہ

دل بھی ایک عجب بستی ہے دُنیا کے معمورے میں

آبادی کی آبادی ہے ویرانے کا ویرانہ

میرے دل میں بسنے والے! آنکھوں سے کیوں دُور ہے تو

آنکھ بھی تیرا کاشانہ ہے دل بھی تیرا کاشانہ

تُو بھی اے آزاد! عجب انسان ہے فانی دُنیا میں

بزم کی بزم ہے شمع کی شمع ہے پروانے کا پروانہ

۱۹۳۸ء

کنارِ راوی

یہ وقتِ شام یہ آبِ رواں یہ تنہائی
سکوتِ شام میں قدرت کی محفل آرائی

فضا میں تین طرف سے ہجومِ ظلمت کا
اور ایک سمت شفق کا وہ رنگِ زیبائی

بجھی وہ چشم زدن میں شفق کی شمعِ حیات
فلک پہ چار طرف گھر کے تیرگی چھائی

وہ تیرگی کے نظارے کا رنگ و کیف بڑھا
سجی حسین ستاروں سے سقفِ بینائی

وہ بزمِ عالمِ بالا میں جلوۂ مہتاب

زمیں کا حسن بڑھانے کو چاندنی آئی

ٹھہر کہ راہزنِ صبر و ہوش ہیں ادی

خرامِ ناز ترا اور شانِ برنائی

ہر ایک موج سے اندازِ دلکشی ظاہر

ہر اک حباب سے بے پردہ رازِ رعنائی

یہ شامِ دشت یہ اُس پر سکوتِ سحر آمیز

فضا میں ہے کسی ساحر کی کار فرمائی

یہ شہر دری کی خموشی میں نوحہ خواں بیدار

کہ جن کے سائے میں اک بادشہ کو نیند آئی

شکستہ حال سرِ راہ ایک بارہ دری

جہاں ہے نورِ جہاں وقفِ کنجِ تنہائی

کہاں وہ شانِ حکومت کہاں وہ کیفِ حرم

کہاں وہ بزمِ شہی کا جلالِ دارائی

کہاں یہ دشتِ مغیلاں کہاں وہ دستہ گُل

کہاں سے آہ اُسے بے کسی کہاں لائی

کہاں وُہ محفلِ رنگیں کہاں وُہ بزمِ نشاط

کہاں یہ عالمِ ہُو اور فضائے صحرائی

ٹھہر ٹھہر دلِ شاعر! یہ وہ نظارا ہے

کہ جس کے چاند ستارے بھی ہیں تماشائی

تماشہ گاہِ زمانہ کو دیکھنے والے!

یہ دیکھ خاک میں سوتا ہے نورِ سینائی

مری نگاہ میں اے کاش نیند بھر دے کوئی

نہیں ہے چشمِ نظارہ کو تابِ بینائی

۱۹۳۶ء

غزل

مری حدِ نظر ہے اور میں ہوں
فریبِ رہگزر ہے اور میں ہوں

اُدھر دنیا ہے اور دنیا کی نظریں
اِدھر میرا ہُنر ہے اور میں ہوں

نگاہوں میں نہیں جچتیں بہاریں
مرا ذوقِ نظر ہے اور میں ہوں

ہنر میرا وُہی افکارِ بے ربط

زمانے کی نظر ہے اور میں ہُوں

وُہی بجلی وُہی عالم، وہی رُت

خیالِ بال و پر ہے اور میں ہوں

وہی دُنیا وہی دُنیا کے انداز

وہی میرا ہُنر ہے اور میں ہوں

مجھے کیا واسطہ منزل سے آزاد

مرا ذوقِ سفر ہے اور میں ہُوں

بیڑا کون لگائے پار

بجلی چمکی بادل گرجا گونج اُٹھا سنسار

لہروں کی آواز ہے یا ہے سانپوں کی پھنکار

آپس میں ہیں چار عناصر لڑنے کو تیار

دُور بھی اور نزدیک بھی پیدا موت کے ہیں آثار

بیڑا کون لگائے پار؟

مٹی پانی آگ، ہوا میں جاری ہے پیکار
سب تدبیریں مات ہوئی ہیں تجویزیں بیکار
چپو ہاتھ سے چھوٹ چکے ہیں، ٹوٹ چکی پتوار
ایسے وقت میں اپنی ٹوٹی ناؤ پھنسی منجدھار

بیڑا کون لگائے پار؟

چاروں سمت آکاش پہ چھائے بادل ہیں گھنگھور
تند ہوا نے آج لگایا اپنا سارا زور
ساگر کے سینے پہ مچایا لہروں نے وہ شور
کان پڑی آواز کا جس سے سننا ہے دشوار

بیڑا کون لگائے پار؟

تلاش

گرچہ ہے مجھے بہت اپنی زندگی عزیز
ایک چیز ہے مگر زندگی سے بھی عزیز

کیفِ نو بہار کی تازگی سے بھی عزیز
فلسفے سے بھی عزیز شاعری سے بھی عزیز

برگِ گل سے بھی عزیز　　گلستاں سے بھی عزیز
ماہِ نو سے بھی عزیز　　کہکشاں سے بھی عزیز

جامِ مے سے بھی عزیز　　چنگ و نے سے بھی عزیز
نغمہ خواں طیور کی　　مست لے سے بھی عزیز

اُس کی اک نگاہ سے　　دل مرا حریفِ طور
پرتوِ جمال سے　　میری روح میں سرور

میرے ذوقِ فکر میں　　زندگی اسی سے ہے
نوبہارِ شعر میں　　تازگی اسی سے ہے

نغمۂ نشاط میں زیر و بم اسی سے ہے
بادۂ حیات میں کیف و کم اسی سے ہے

اس کے باوجود وہ دل پہ ایک راز ہے
دل پہ راز ہے مگر پھر بھی دلنواز ہے

○

انجام جانتا ہوں میں اُن کا کہ بارہا
میں نے سفر کیا ہے بہاروں کے ساتھ ساتھ

غزل

بہار میں فروغِ گلستاں کو بے وقار کر
جمالِ دل فریب کو حریفِ لالہ زار کر

چمن میں خامشی سی ہے فضا اُداس اُداس ہے
چمن کو خواب سے جگا فضا کو بیقرار کر

اگر ہو دوست ملتفت غمِ زمانہ بھول جا
بس ایک زیرِ لب ہنسی پہ درد و غم نثار کر

وہ دورِ زندگی ہی کیا کہ جس میں حادثے نہ ہوں
کسی سے دل کا راز کہہ کسی کا انتظار کر

ہوس پرست بازلیت کی نشاط اور چیز ہے
مذاقِ دل بلند کر نظر کو استوار کر

نشانِ منزلِ طلب نظر کی حد سے دور ہے
جو دِل میں حوصلہ نہیں تو صبر اختیار کر

ترے کمال کی قسم ترا ہی ایک نقش ہوں
سنوار دے بگاڑ کر بگاڑ دے سنوار کر

جوشؔ کے بعد

ہمنشیں پوچھ نہ آزاد سے تُو، کیا ہوگا
عالمِ انجمنِ دیدہ وراں جوشؔ کے بعد

ہوگی اس طرح سے برہم کہ سجے گی نہ کبھی
آج کی محفلِ صاحب نظراں جوشؔ کے بعد

جانتے ہیں ادب و شعر کا ہوگا جو نصیب
ہم کو معلوم ہے انجامِ زباں جوشؔ کے بعد

یہ بھی کہنا نہیں آسان مِلے گا کہ نہیں
ادب و فن کا کوئی نام و نشاں جوشؔ کے بعد

ایک آوازِ فغاں ہوگی لبِ اردو پر

سینۂ شعر سے اُٹھے گا دھواں جوشؔ کے بعد

ذہن و افکار پہ چھائے گی یقیں کی ظلمت

سرد ہو جائے گی قندیلِ گُماں جوشؔ کے بعد

تشنہ لب فکر اندھیرے میں بھٹکتا ہوگا

مضطرب شوق نہ پائے گا اماں جوشؔ کے بعد

صحنِ گلزار سے روتی ہوئی جائے گی بہار

مسکراتی ہوئی آئے گی خزاں جوشؔ کے بعد

حسرتِ دید میں آ آ کے پریشاں ہوگا

سرِ کہسار گھٹاؤں کا دھواں جوشؔ کے بعد

سرِ مے خانہ سے آ آ کے پلٹ جائے گا

پے بہ پے سلسلۂ ابرِ رواں جوشؔ کے بعد

کچھ بڑی بات نہیں ہے جو شکستہ ہو جائے

بزم میں حوصلۂ پیرِ مغاں جوشؔ کے بعد

اپنی تقدیر پہ فریاد کریں گے شب و روز

مئے دیرینہ و معشوقِ جواں جوشؔ کے بعد

دلبراں، گلبدناں، سیم تناں، ماہ وشاں

ان کو دیکھے گی نظر نالہ کُناں جوشؔ کے بعد

کیا خبر عالمِ بیچارگیٔ حُسن ہو کیا

کیا کہوں بے کسیٔ عشقِ جواں جوشؔ کے بعد

لیلیٔ شعر کے لب پر یہ سوال آئے گا

کون ہے آج مرا مرتبہ داں جوشؔ کے بعد

دے سکا کوئی جو تسکین تو دے گا اس کو

فقط آزادؔ کا اندازِ بیاں جوشؔ کے بعد

غزل

جب جوشِ جنوں ہو گرمِ سفر وہ بند و سلاسل کیا جانے
طوفان جب اپنی موج میں ہو پابندئ ساحل کیا جانے

جو برق میں ضَو ہے شمع میں لَو پارے میں تڑپ کوندے میں لپک
پابندِ طلسمِ دیر و حرم وُہ درد ترا دل کیا جانے

وہ عزم ہے جو لے آتا ہے قدموں تک کھینچ کے منزل کو
اِس راز کو رہبر کیا سمجھے اِس بھید کو منزل کیا جانے

ہر گام پہ کیوں بل کھا کھا کر بے تاب بگولے اُٹھتے ہیں

محمل کو اِس کی خبر کیا ہے اس بات کو محمل کیا جانے

منجدھار میں جب کشتی پہنچی، کشتی والوں پہ کیا گذری

یہ طوفانوں کی باتیں ہیں آسودۂ ساحل کیا جانے

جب عشق ہو اپنی دُھن میں رواں بےخوف و خطر منزل کی طرف

وہ راہ کی مشکل کیا سمجھے وہ دُوریٔ منزل کیا جانے

آزاد ہے محوِ جہد و عمل انجام پہ کب ہے اس کی نظر

یہ کشتِ عمل کا دیوانہ اس کشت کا حاصل کیا جانے

ماتمِ اقبال

پھر نالہ ہائے غم سے ہے لبریز دل کا ساز
پھر ہو گیا ہے دیدۂ حیراں گُہر طراز

وُہ حق شناس فلسفی و مردِ نکتہ داں
وُہ باکمال شاعر و درویشِ پاکباز

نغمے تھے جس سخنورِ عالی دماغ کے
مشرق میں دلپذیر تو مغرب میں جاں نواز

تیرِ اجل نے اُس کو نشانہ بنا لیا

تھا ہم کو آہ جس کے کمالِ سخن پہ ناز

محفل سے آج ساقیٔ محفل ہی اُٹھ گیا

آزاد اب کہاں وُہ شرابِ جگر گداز

ہر بزم وقفِ نالۂ غم ہے ہزار حیف

خونابہ بار دیدۂ نم ہے ہزار حیف

اقبال! اے جہانِ معانی کے تاجدار

اے رومی و سنائی و غالب کی یادگار

معنیٰ کو تجھ پہ فخر، تخیّل کو تجھ پہ ناز

نازاں تھا تجھ پہ مشرق و مغرب کا ہر دیار

آتش کا سوز، گُل کی مہک، برق کی تڑپ

سو جاں سے ہو گئے تری تخئیل پر نثار

تو نے سخن کو زندۂ جاوید کر دیا

تیرے نفس نے دی چمنِ شعر کو بہار

دو گز زمین آہ تجھے راس آ گئی

شہرت پہ تیری تنگ تھا دامانِ روزگار

گو زیرِ خاک کالبدِ خاک آ گیا

تو رُوح بن کے عالمِ جاں میں سما گیا

اے مزرعِ سخن پہ برستے ہوئے سحاب

اے مطلعِ وطن کے درخشندہ آفتاب

جاں بخش تیری نظم کا ہر استعارہ ہے

ہر لفظ بے مثال ہے ہر شعر لاجواب

اب آ کے کون دے گا گلِ شعر کو مہک

بخشے گا کون گوہرِ معنی کو آب و تاب

کہتے ہیں ترجمانِ حقیقت بجا تجھے

ہر رازِ حق تھا دیدۂ باطن پہ بے نقاب

رُتبہ تری خودی کا نہایت بلند تھا

تجھ سے ترے خدا نے کیا بارہا خطاب

اِس دَور میں تو آگہِ رازِ قدیم تھا

جو ہو حریفِ جلوۂ حق وہ کلیم تھا

جس کی صداؤں پہ ہمہ تن گوش تھے سروش

وہ جامِ رُوح پرورِ عرفاں کا بادہ نوش

جس کی نوا سے نادرِ افغاں[1] تڑپ اُٹھا

اُف ہو گیا وہ شاعرِ آتش نوا خموش

---

[1] سوختیم ماز گرمئ آوازِ تو — اے خوش آں قومے کہ داند رازِ تو
از غمِ تو ملّتِ ما آشنا است — می شناسیم ایں نوا ہا از کجا ست

رنگیں[1] تھا جس کے حسنِ تخیّل سے برگِ گُل

جس کی گرج سے موجۂ طوفاں میں تھا خروش

سینوں میں جس نے قوّتِ گفتار سے بھرا

صہبائے بے خودی کا سرور و عمل کا جوش

اے بآغوشِ سحابِ ما چو برق | روشن و تابندہ از نورِ تو شرق
یک زماں در کوہسارِ ما درخش | عشق را باز آں تب و تابے بہ بخش

تا کجا در بند و غم باشی اسیر

تو کلیمی راہِ سینائے بگیر"

(مسافر)

---

[1] برگِ گُل رنگیں ز مضمونِ من است | مصرعِ من قطرۂ خونِ من است

(پیامِ مشرق)

تھا جس کے سانس سانس میں میخانۂ حیات

تُربت ہے اُس کی سایۂ مسجد میں سبز پوش

ہے خاک میں وہ عرشِ معانی ہزار حیف

اے انقلابِ عالمِ فانی ہزار حیف

۳۸ء

○

ابھی اس راہ سے واقف نہیں دل

خودی کی چاہ سے واقف نہیں دل

ابھی دل میں ہے خاشاکِ من و تُو

کہ تیری آہ سے واقف نہیں دل

رباعیات

ہر نظم تری ہے آسمانِ معنی

ہر شعر ترا ہے کہکشانِ معنی

کیا نیر تیرے کلام کی ہو توصیف بیاں

ہر لفظ میں بستا ہے جہانِ معنی

ہر شوق ہے شیدائے کلامِ اقبال

ہر فکر ہے وارفتۂ کلامِ اقبال

کیا خوب گرامی نے کہا ہے آزاد

"شہبازِ معانی است بہ دامِ اقبال"

○

لبریزِ حقیقت ہے پیامِ اقبال

الہام ہے الہام کلامِ اقبال

دِل کش نغمات میں کشش کتنی ہے

آزاد ہُوا اسیرِ دامِ اقبال

ہر بزم کی زینت ہے فسانہ تیرا
مدّاح ہے حشر تک زمانہ تیرا
لب بند کئے ترے اجل نے لیکن
ہر دل میں ہے مرتعش ترانہ تیرا

تضمینات

(۱)

فرمانِ خدا

فرشتوں سے

محتاج و غنی میں جو تفاوت ہے مٹا دو

انسان کو انسان کا ہمدرد بنا دو

اربابِ رعونت کو رعونت کی سزا دو

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

کاخِ اُمراء کے در و دیوار ہلا دو

پیدا کرو انوارِ عمل روئے زمیں سے

بڑھ کر ہوں چمک میں جو ستاروں کی جبیں سے

تعمیر ہو اک عالمِ پائندہ یہیں سے

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے

کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

ہر لب پہ ہے آزادیٔ کامل کا ترانہ

اس دور میں شاہوں کی حکومت ہے فسانہ

درکار ہے اس قصر کے گرنے کو بہانہ

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ

جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جب نورِ ازل مژدۂ پیغامِ سحر دے

ظلمت گہِ آفاق میں کیوں جانِ بشر دے

مابین جو پردے ہیں کوئی چاک انہیں کر دے

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے

پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو

یہ عالمِ نو ایک عجب رَو پہ رواں ہے

بے راہ روی اس کی تباہی کا نشاں ہے

افزائشِ سامانِ طرب کاہشِ جاں ہے

تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے

آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

(۲)

دُعا

میرا دلِ مطمئن طالبِ نانِ شعیر

قیدِ جہاں سے بَری گرچہ بظاہر اسیر

مجھ میں نہ پیدا ہُوا شوقِ لباسِ حریر

دولتِ لعل و گہر میری نظر میں حقیر

می نہ برد حاجتے پیشِ سلاطیں فقیر

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر

میرا نشیمن بھی تو شاخِ نشیمن بھی تو

صحبتِ اہلِ صفا حُسنِ ازل کا ظہور

صحبتِ اہلِ صفا وادیٔ ایمن کا نُور

صحبتِ اہلِ صفا دُشمنِ فسق و فجور

دُشمنِ فسق و فجور حاملِ ذوقِ حضور

حاملِ ذوقِ حضور قاطعِ کبر و غرور

صحبتِ اہلِ صفا نُور و حضور و سرور

سرخوش و پُرسوز ہے لالۂ لبِ آب جو

خالقِ کون و مکاں مالکِ غیب و حضور

میری مئے زیست میں تیرے کرم سے سرور

روح کی گہرائی میں فیض ترا دُور دُور

عالمِ تاریک میں تیری تجلّی سے نُور

تجھ سے ہے سینہ مرا رُو کشِ کہسارِ طوُر

تجھ سے گریباں مرا مطلعِ صبحِ نشور

تُجھ سے مرے سینے میں آتشِ اللہ ہو

میری تمنّاؤں کا پھُول نہ اب تک کِھلا

سوز و تب و تاب و غم میری طلب کا صلہ

آرزوئے شوق میں اور مجھے کیا مِلا

رُوح میں موجود ہے درد کا اک سلسلہ

عزم کو درپیش ہے صبر شکن مرحلہ

تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ

اپنے لئے لامکاں میرے لئے چار سُو

(۳)

محراب گل افغان کے افکار

(۱)

رشتۂ حبِّ وطن توڑ کے جاؤں کہاں

تیری فضاؤں سے مُنہ موڑ کے جاؤں کہاں

میرے کہستاں تجھے چھوڑ کے جاؤں کہاں

تیری چٹانوں میں ہے میرے اب و جد کی خاک

تیری ہوا دل کشا، تیری فضا دل نشیں
تجھ سے دلآرا نہیں اور کوئی سرزمیں
تیرے خم و پیچ میں میری بہشتِ بریں
خاک تری عنبریں، آب ترا تابناک

عرش سے بھی ہے بلند میری خودی کا مقام
خواہشِ بزمِ شہی مجھ پہ سراپا حرام
باز نہ ہوگا کبھی بندۂ کبک و حمام
حفظِ بدن کے لئے رُوح کو کردوں ہلاک

ایک طرف بزمِ رنگ ایک طرف یہ فضا
ایک طرف اہرمن، ایک طرف ہے خدا
اے مرے فقرِ غیور! فیصلہ تیرا ہے کیا
خلعتِ انگریز یا پیرہنِ چاک چاک

(۲)

زمانہ روزِ ازل سے یہ دے رہا ہے پیام
وہی ہے زندہ سکوں کی طلب ہے جس پہ حرام
حقیقتِ اَزلی ہے رقابتِ اقوام
نگاہِ پیرِ فلک میں نہ میں عزیز نہ تُو

نظر نہ آئے گا تجھ کو کوئی حریف ترا
نہ ہو گا تیرے جہاں میں کوئی بھی تیرے سوا
رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اُتر گیا جو ترے دل میں لَا شَرِیْکَ لَہٗ

ترے لہو میں سرورِ شراب ہو پیدا

تری ضعیفی میں رنگِ شباب ہو پیدا

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا

عجب نہیں ہے کہ یہ چار سُو بدل جائے

خودی

فانی و باقی گرفتارِ خودی است

دل درونِ سینہ معمارِ خودی است

"پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است

آنچہ می بینی ز اسرارِ خودی است"

در تہی دستی ترا خود دار کرد

از شراب فقر و دیں سرشار کرد

"خویشتن را چوں خودی بیدار کرد

آشکارا عالم پندار کرد"

(۵)

عشق

عشق کی نالش سے ہے دامنِ گُل چاک چاک

عشق کے جلووں سے ہے سینہ گناہوں سے پاک

عشق کے دم سے ہوئی عرش کی ہم پایہ خاک

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک

عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام

عشق کے حلقے میں ہے جلوہ گہِ ہست و بود

روز و شب و صبح و شام خاک و سپہرِ کبود

بستہ مسائل کی ہے عشق کے دم سے کشود

عشق فقیہِ حرم عشق امیرِ جنود

عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام

(۶)

سُلطان ٹیپو کی وصیّت

دریا و دشت و کوہ کا حاصل نہ کر قبول

جو شے نہ ہو مذاق کے قابل نہ کر قبول

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول

لیلیٰ بھی ہمنشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

مانا کہ راستے کی فضائیں ہیں عطر بیز
مانا کہ ذرّہ ذرّہ ہے ساحل کا کیف ریز
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل اگر عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

تو ذاتِ بے مثال ہے اپنی صفات میں
کوئی نہیں شریک ترا شش جہات میں
کھویا نہ جا صنمکدۂ کائنات میں
محفل گداز گرمئ محفل نہ کر قبول

نذرِ اقبال

یہ تین شعر ایک مختصر سے مجموعۂ کلام کا انتساب
ہیں جو ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں تلف ہو گیا

مجھے شکایتِ بے مائگی نہیں ہرگز
کہ آشنا ہے ترے خُم سے ذوقِ خام مرا

لٹائی تھی جو کبھی ساقیٔ سخن تو نے
اُسی شراب سے ہے مستفیض جام مرا

ترے کلام نے بخشا مجھے مذاقِ سخن
ہے تیری نذر یہ مجموعۂ کلام مرا

ٹیگور کی موت پر

منزلِ پائندہ تر در نگہِ خویش داشت

شاعرِ قدسی نژاد عالمِ خاکی گذاشت

عالمِ خاکی گذاشت ، عالمِ بالا گزید

سوئے گلستانِ خود طائرِ معنی پرید

عالمِ خاکی ، مادرِ خورِ طبعش نہ بود

چشم برایں خاک بست بر طبقِ آں کشود

بُود نہ از خاکِ ما رشتہ و پیوندِ اُو

از دو جہاں بے نیاز خاطرِ خورسندِ او

بود در اہلِ وطن بندۂ صاحب نظر

ما نہ جہانِ دگر اُو نہ جہانِ دگر

دیدۂ بیدارِ اُو صیرفیٔ کائنات

اُو بہ جہانِ صفات دید تجلّیٔ ذات

برگِ گل و لالہ را دید نگاہش بہ خار

آنچہ نہاں بہرِ ما بر نگہش آشکار

بر نگہش توتیا سبزہ و بادِ سحر

شبنم و آبِ رواں اختر و مہر و قمر

عالمِ در پردۂ بر نگہش بے حجاب

دیدہ اَش آزاد از کشمکشِ پیچ و تاب

گلشنِ شعر و سخن از نفَسَش پر بہار

عالمِ رُوحانیاں از نگہش آبدار

مایۂ ہستیٔ او عفّتِ قلب و نگاہ

دیدۂ او بود بر آئینۂ مہر و ماہ

از نفسش گل شدہ غنچۂ دلگیرِ ما

صاحبِ فیضِ نظر راہبرِ پیرِ ما

کشورِ ہندوستاں از عملش سربلند

از ہنرش سرخرو از سخنش ارجمند

او ز کہن عارفاں در وطنم یادگار

گلشنِ افکار از خونِ دلش پُر بہار

بود بہ خاکِ وطن گوہرِ یک دانۂ

گرچہ فقیرے ولے شانِ ملوکانۂ

اہلِ وطن مضطرب، اہلِ جہاں بیقرار

آہ ز تو اے حیات! اے نفسِ مستعار!

سنہ ۱۹۴۱ء

غزل

دل کی بلندیوں پہ بھی برقِ نظر گرا کے دیکھ
طُور کو آزما لیا مجھ کو بھی آزما کے دیکھ

عشق کی رزم گاہ میں کتنا سرور و کیف ہے
عقل کی بزم گاہ سے دامنِ دل ہٹا کے دیکھ

کیفیتِ ظن و گماں لطفِ یقیں سے کم نہیں
بزمِ گماں کا رنگ و نور شمعِ یقیں بجھا کے دیکھ

علم ہے کیفِ بے ثبات عشق ہے گرمیٔ حیات
زیست کی یہ حقیقتیں دل کے قریب آ کے دیکھ

رُباعیات

اِن میں سے بعض رباعیات بحرِ ہزج کے ایک مختلف زحاف میں ہیں۔ ممکن ہے بعض سخن فہم حضرات انھیں قطعات کہیں، لیکن میں باباطاہرؒ اور علامہ اقبالؒ کی تقلید میں انھیں رباعیات ہی سمجھتا ہوں

طوفانِ حیات لے کے آئی ہے سحر
ہر شے پہ سرور بن کے چھائی ہے سحر
کیوں ظلمتِ یاس میں گِھرا ہے اے دل
وُہ دیکھ اُفق پہ جگمگائی ہے سحر

جیسے دُرِّ عدن سے نکلے

یا لعلِ یمن کانِ یمن سے نکلے

یا جیسے شمیمِ گُل چمن سے نکلے

آزاد ہم اس طرح وطن سے نکلے

○

ہو دورِ خزاں میں گُم بہاروں کو نہ دیکھ

گلزار کے شاداب نظاروں کو نہ دیکھ

ذرّوں کو سمجھنے کی ہے توفیق اگر

افلاک پہ تابندہ ستاروں کو نہ دیکھ

ذرّات سے طوفان اُٹھاتا ہوا چل

ہر نقشِ مخالف کو مٹاتا ہوا چل

منزل یہ تری دارِ فنا ہے لیکن

اس دارِ فنا میں دندناتا ہوا چل

○

گیرم کہ وجودِ من سراپا خاک است

چیزے است دراں کہ غیرتِ افلاک است

مانندِ سر ورے کہ نہاں شد بہ شراب

ہم رنگِ شرابے کہ نہاں در تاک است

زمین و آسماں در سینۂ من
مکان و لامکاں در سینۂ من
زبانم دہ کہ پیشِ تو کنم فاش
نمی گنجد فغاں در سینۂ من

○

ہر غنچہ و گل کو نوجوانی دے دے
عالم کو نشاط و شادمانی دے دے
اے ابرِ بہار تیری رحمت کے نثار
مرجھائے چمن کو زندگانی دے دے

نغمے کے فسوں میں رات ڈوبی آزاد

اک کیف میں کُل حیات ڈوبی آزاد

یہ کس کی ہوئی نوا فضاؤں میں بلند

تاثیر میں کائنات ڈوبی آزاد

○

تجلّی ہے سراپا نور ہے تُو

خس و خاشاک میں مستور ہے تُو

اگر اپنی حقیقت پر نظر ہو

حریفِ برقِ اوجِ طور ہے تو

دریں بزم خس و خاشاک ساماں

ہم آہنگی مکن با خاک اے دل

تجمل سازِ اختر و شمس و قمر را

نگاہے کن سوئے افلاک اے دل

○

کبھی میں ہم کلام اقبال سے ہوں

کبھی رومی سے ہوں محوِ سخن میں

مری تنہائی کا عالم نہ پوچھو

کہ تنہائی میں ہوں اک انجمن میں

خرد پابندِ افسونِ جنون است

نگاہم بے قرار و بے سکون است

خداوندا بہ حالِ دل نگاہے

کہ دل از شدّتِ احساس خون است

○

لازم نہیں حُسن کے لیئے کوئی بناؤ

ہے حُسن تو محض جِلد کا ایک تناؤ

جیسے کہ جمالِ شعر میں آتا ہے

جِس وقت کہ شعر میں ہو لفظوں کا کھچاؤ

بے باک گھٹاؤں کے سلام آئے ہیں

بدمستی و رندی کے پیام آئے ہیں

اے رحمتِ ساقی کو ترسنے والے

وُہ دیکھ چھلکتے ہوئے جام آئے ہیں

○

اُٹھے وُہ فضا میں ہلکے ہلکے بادل

لو شانۂ افلاک پہ ڈھلکے بادل

سرشار جہاں ہُوا ہے وُہ چھینٹوں سے

ساغر کوئی چھلکا ہے کہ چھلکے بادل

ہر شئے کا ہے انداز بدلنے والا

ہر خار ہے گلشن سے نکلنے والا

مشرق کی طرف دیکھ کہ تاریکی میں

اک نُور کا چشمہ ہے اُبلنے والا

○

محبوب ہے احباب میں نامِ آزاد

لبریزِ مئے وفا ہے جامِ آزاد

جذبات کے ترجمان ہیں اشعار اس کے

خالی ہے قصیدوں سے کلامِ آزاد

غزل

ہر شوق فنا انجام ہُوا ہر جذبۂ دل ناکام ہُوا

ہر مشکل اب آسان ہوئی ہر درد کو اب آرام ہُوا

اب رُوح کی بےتابی کو تسکین تو ہے آرام تو ہے

مانا کہ جنوں کے سامنے پھر احساسِ خرد ناکام ہُوا

اُس جانِ تمنّا سے دُوری الزام بھی ہے انعام بھی ہے

سمجھیں تو یہی الزام ہُوا سمجھیں تو یہی انعام ہُوا

اِس باغ کا ہے دستور نیا اے دیدۂ دِل ہشیار ذرا
ظاہر کی نہ آنکھیں دیکھیں گی ہر رنگِ زمیں گر دام ہُوا
کیا سوچ کے جانے آیا تھا انسان بچپارہ دُنیا میں
مجبورِ طلسمِ صبح ہُوا پابستۂ فریبِ شام ہُوا

○

از سوزِ درُوں پیدا آں طلعتِ زیبا کُن
مہر و مہ و اختر را مصروفِ تماشا کُن
در عشق و خرد اے دل دانی کہ تفاوت چیست
عشق است تماشائے عقل است تماشا کُن

ذرا مرے قریب آ

مری نظر سے دُور ہے مری سمجھ سے ماورا
یہ خامشی کی گفتگو، نگاہ کا یہ سلسلہ
مرے قریب آ کہ میں تجھے ذرا سمجھ سکوں

ذرا مرے قریب آ

جو ہو سکے کبھی ترا مرے مقام سے گذر
تو ہو مری نظر کے اضطراب کو بھی یہ خبر
کہ تیری زندگی کا آسرا خرد ہے یا جنوں

ذرا مرے قریب آ

یہ اور بات ہے مری نظر نے تجھ کو چھو لیا
کبھی کبھی خیالِ بے خبر نے تجھ کو چھو لیا
مری تو انتہا یہ ہے کہ میں بھی تجھ کو چھو سکوں

ذرا مرے قریب آ

ستارہ ہائے ضوفشاں چمک چمک کے بجھ گئے
چراغِ ماہ و کہکشاں دمک دمک کے بجھ گئے
مگر محیط ہے ابھی نگاہ پر کوئی فسوں

ذرا مرے قریب آ

وہ ایک داستاں کہ جو شہیدِ اضطراب ہے
وہ ایک حرفِ آرزو کہ محوِ پیچ و تاب ہے
جو تو ہو مجھ سے اس قدر پرے تو کس طرح کہوں

ذرا مرے قریب آ

غزل

ہُوا معلوم آخر بعد صد آزارِ جاں کاہی

کہ ہے دل کی پریشانی مآلِ ذوقِ آگاہی

کچھ اِس انداز سے شیرازۂ گل خاک پر بکھرا

مرے دل کو پریشاں کر گئی بادِ سحر گاہی

نہ چھوڑ اے دل جہانِ شور و شر میں راستہ اپنا

تہِ دریا بھی ہے ذوقِ تجسّس رہبرِ ماہی

خدا جانے تری فرقت زیاں ہے سُود ہے کیا ہے

تجھے کھویا تو پائی لذتِ آہِ سحر گاہی

نہ منزل کا نشاں پیدا نہ کوئی ہمسفر میرا

بیاباں کی یہ حالت اور میں بھٹکا ہُوا راہی

شہنشاہی اسیری ہے دلِ محکُوم کے باعث

دلِ آزاد کے دم سے اسیری ہے شہنشاہی

قطعہ

نصف شب کو شہر میں اک آتشیں گولہ پھٹا

شہر کی تاریکیوں میں بجلیاں لہرا گئیں

کیا خبر اس نور میں کتنے شرارے کھو گئے

اس ضیا میں کیسی کیسی صورتیں سنولا گئیں

سلام

سلام اُس ذاتِ اقدس پر، سلام اُس فخرِ دوراں پر
ہزاروں جس کے احسانات ہیں دُنیائے امکاں پر

سلام اُس پر جو حامی بن کے آیا غم نصیبوں کا
رہا جو بیکسوں کا آسرا مشفق غریبوں کا

سلام اُس پر جو آیا رحمتہ العالمیں بن کر
پیامِ دوست لے کر، صادق الوعد و امیں بن کر

سلام اُس پر کہ جس کے نور سے پُرنور ہے دُنیا

سلام اُس پر کہ جس کے نطق سے مسحور ہے دُنیا

سلام اُس پر کہ جس نے بے زبانوں کو زباں بخشی

سلام اُس پر کہ جس نے ناتوانوں کو تواں بخشی

سلام اُس پر جلائی شمعِ عرفاں جس نے سینوں میں

کیا حق کے لئے بیتاب سجدوں کو جبینوں میں

سلام اُس پر بنایا جس نے دیوانوں کو فرزانہ

مئے حکمت کا چھلکایا جہاں میں جس نے پیمانہ

بڑے چھوٹے میں جس نے اک اخوّت کی بِنا ڈالی

زمانے سے تمیزِ بندہ و آقا مٹا ڈالی

سلام اُس پر فقیری میں نہاں تھی جس کی سلطانی

رہا زیرِ قدم جس کے شکوہ و فرِّ خاقانی

سلام اُس پر جو ہے آسودہ زیرِ گنبدِ خضرا

زمانہ آج بھی ہے جس کے در پر ناصیہ فرسا

سلام اُس پر کہ جس نے ظلم سہہ سہہ کر دعائیں دیں

وہ جس نے کھائے پتھر گالیاں اِس پر دعائیں دیں

سلام اُس ذاتِ اقدس پر حیاتِ جاودانی کا

سلام آزاد کا آزاد کی رنگیں بیانی کا

ہم

اپنوں کی بزم سے جو اٹھائے ہوئے ہیں ہم
اغیار میں وقار گنوائے ہوئے ہیں ہم

شاید جو عمر بھر نہ ہمیں یاد کر سکیں
سینے سے اُن کی یاد لگائے ہوئے ہیں ہم

کیا ہو اُمید چشمِ گہر ناشناس سے
موتی ہیں اور مفت لٹائے ہوئے ہیں ہم

اے اہلِ بزم ہم سے یہ آزردگی ہے کیوں
آئے نہیں ہیں کھینچ کے لائے ہوئے ہیں ہم

ہم گردشِ زماں کے ستائے ہوئے نہیں

بے مہریٔ بشر کے ستائے ہوئے ہیں ہم

گوہر ہیں اور کوئی ہمیں پوچھتا نہیں

دامانِ دشت و در میں رلائے ہوئے ہیں ہم

(۴)

چمکیں گے مثلِ شعلۂ خورشید ایک دن

پھونکوں سے آج اگرچہ بجھائے ہوئے ہیں ہم

اب بھی وہ رفعتیں ہیں نگاہوں کے روبرو

جن رفعتوں سے آج گرائے ہوئے ہیں ہم

احساس یہ تجھے بھی دلائیں گے ایک دن

اے دوست! تیری بزم میں آئے ہوئے ہیں ہم

جیسے چمن میں رنگِ چمن، رنگ میں سُرور

یوں محفلِ جنوں میں سمائے ہُوئے ہیں ہم

اے برق ہوشیار! ہُوا کیا جو آج کل

زد پر تری نگاہ کے آئے ہوئے ہیں ہم

اے دشت! رنگ و بُو میں بسائیں گے ہم تجھے

خود جیسے رنگ و بُو میں بسائے ہُوئے ہیں ہم

(۳)

ٹوٹے ہوئے دلوں کو ملاتے رہے ہیں جو

نغمے وہ اپنے ساتھ ہی لائے ہوئے ہیں ہم

ڈھانپا جنہوں نے روشنیٔ مہر و ماہ کو

پردے وہ مدّتوں سے اُٹھائے ہوئے ہیں ہم

نازاں ہے ہم پہ ذوقِ تمدّن کہ آج بھی

مہر و وفا کی بزم سجائے ہوئے ہیں ہم

کانٹوں پہ ہم کو پھینک دیا گرچہ وقت نے

کانٹوں سے دامن اپنا بچائے ہوئے ہیں ہم

بجھنے نہ دیں گے مہر و مروّت کی روشنی

یہ عزم لے کے دہر میں آئے ہوئے ہیں ہم

اے ارتقائے عظمتِ آدم! نہ خوف کھا

سوگند تیرے نام کی کھائے ہوئے ہیں ہم

رُک جاؤ جہل و فتنۂ دوراں کی آندھیو!

کہسار بن کے راہ میں آئے ہوئے ہیں ہم

ہر سمت سے اگرچہ ہواؤں کا زور ہے

شمعِ خلوص پھر بھی جلائے ہوئے ہیں ہم

نانک

گورو نانک! خزاں کے دور دورے میں قدم تیرا

ریاضِ ہند میں آیا بہارِ جاوداں ہو کر

تو اک ابرِ کرم تھا جو زمانِ خشک سالی میں

دیارِ ہند پر برسا محیطِ بیکراں ہو کر

زمینِ کشورِ پنجاب کی تقدیر کیا کہیے

چمک اُٹھا ہر اک ذرہ حریفِ کہکشاں ہو کر

ترا یُمنِ قدم ہی تھا کہ راہِ عشق و مستی پر

چلا پھر سے کارواں اپنا امیرِ کارواں ہو کر

یقیں کے رنگ میں درماں تری تعلیم لے آئی

کبھی جب کرب اُٹھّا ذہنِ انساں میں گماں ہو کر

سازِ ہندی

بھگت کبیر کا ایک نغمہ

اے مجھ کو تلاش کرنے والے

میں تیرے قریب ہوں یہیں ہوں

تیری رگِ جاں سے بھی قریں ہوں

مندر میں نہیں قیام میرا

مسجد بھی نہیں مقام میرا

کعبہ نہیں میرا آستانہ
کیلاش نہیں میرا ٹھکانہ

رسموں میں گھرا ہوا نہیں میں
پردوں میں چھپا ہُوا نہیں میں

اے مجھ کو تلاش کرنے والے

میں تیرے قریب ہوں یہیں ہوں
تیری رگِ جاں سے بھی قریں ہوں

صادق ہے گر اشتیاق تیرا
مشکل نہیں کچھ وصال میرا

اپنا مجھے بیگماں سمجھ تو
اس شوق کو کامراں سمجھ تو

اے دوست! کبیر کا ہے یہ قول

بھارت کے فقیر کا ہے یہ قول

وُہ ذات ہے زندگی نفس کی

وُہ ذات ہے کیا؟ "خدا جرس کی"

○

تُند گرداب تھا ساحل تھا بہت دُور مگر

نہ تو گرداب سے شکوہ ہے نہ ساحل سے گلہ

خود تمنائی انوار تھے اپنا ہے قصور

اب ہو کیوں برق سے یا برق کے حاصل سے گلہ

اصغر بشیر

روروکے کہہ رہا تھا دلِ غم نصیب یوں

اصغر کی موت سانحۂ جانگداز ہے

یہ بات سُن کے صبر نے آہستہ سے کہا

"اللہ تیری ذات بڑی بے نیاز ہے"

اصغر بشیر۔ میاں بشیر احمد (ایڈیٹر ہمایوں) کا فرزند جو آکسفورڈ سٹریم میں گر کر جاں بحق تسلیم ہوا۔

غزل

ادھر جلووں کی روز افزوں فراوانی نہیں جاتی

ادھر اپنی نظر کی تنگ دامانی نہیں جاتی

جہاں سے جب تلک رسمِ جہانبانی نہیں جاتی

یہ انساں کی مصیبت یہ پریشانی نہیں جاتی

میسر نعمتِ آسائشِ جاں آ نہیں سکتی

ترے دل سے اگر حُبِّ تن آسانی نہیں جاتی

بہائم پیشگی نے اس کا وہ حلیہ بگاڑا ہے
کہ اب انسانیت کی شکل پہچانی نہیں جاتی

حریمِ عشق کی حد سے ادھر ہے سب بُت آرائی
بُت آرائی سے آگے عقلِ انسانی نہیں جاتی

وہی بلبل ہے رازِ گلستاں کو جاننے والا
خزاں آنے پہ بھی جس کی خوش الحانی نہیں جاتی

فریبِ منظر

اِک روشنی اُفق پہ نمایاں ہوئی تو تھی

جس سے منظر فریب نہ ہوا تھا یہ خاکداں

ہر سمت سے اگرچہ ہواؤں کا زور تھا

قندیل سی فضا میں فروزاں ہوئی تو تھی

لیکن وُہ ضو کہ جس کو فریبِ نظر کہیں

چشمک تھی برق کی کہ تبسّم شرار کا

منزل بھی گم رہی رہِ منزل بھی بے نشاں

اب کیا اُسے چراغِ سرِ رہگذر کہیں

انوار وہ پلٹ کے نہ جانے کہاں گئے

دیکھا تو پھر فضا میں دُھندلکے تھے گرمِ سیر

پردہ سا اک بہ حدِّ نظر پھیلتا گیا

جلوے سمٹ کے نہ جانے کہاں گئے

اشعار

فقط حجاب ہیں نظروں پہ اور کچھ بھی نہیں

یہ مہر و مہ یہ ستارے یہ آسماں یہ زمیں

یہ دوستوں کا رویّہ، یہ دشمنوں کا سلوک

جو مجھ سے پوچھ تو دونوں میں کوئی فرق نہیں

غزل یہ جس نے لکھی ہے سلام شوق اُسے

"شراب لعل کش و روئے مہ جبیناں بیں"

ہو جس میں بُوئے وفا اور رنگِ صدق و صفا

ریاضِ دہر میں یارب! وہ پھول ہے کہ نہیں

○

سماج کے اے قدیم ڈھانچے حیات سے تازگی چُرا کر

سنور رہا ہے تو کس لئے تو تجھے تو اب ٹوٹنا پڑے گا۔

پلانے والے خبر بھی ہے پستی و بلندی روا ہو جس میں

یہ پینے والوں کے ہیں ارادے وہ میکدہ ٹوٹنا پڑے گا

رہے گا بطنِ خزف میں کب تک حیات کے بیقرار لاوے

یہ وقت لے کر پیام آیا کہ اب تجھے پھوٹنا پڑے گا

○

در پیکرِ خاک من جانے است گرفتارے

اندر مِزازل نالاں در سازِ دلم تارے

اے عقلِ فسوں پیشہ کردی تو عجب کارے

در دستِ تو تسبیحے بر دوشِ تو زنّارے

آں حُسنِ دلآدیزے مجموعۂ اضداد است

دل پارۂ از سنگے رُخ روکشِ گلنارے

اے گیسوئے سحر افزا تابِ تو فزودن بادا

در حلقۂ دامِ تو آزاد گرفتارے

○

جواب گوشۂ زنداں کا گلستاں میں نہیں

مزا قفس میں جو آیا ہے آشیاں میں نہیں

مثالِ لالۂ صحرا ہوں سب سے بیگانہ

میں اس جہاں میں ہوں لیکن دل اس جہاں میں نہیں

نگاہ ڈال ذرا اپنے دل کی وسعت پر

جو بات اس میں ہے پہنائے آسماں میں نہیں

○

ذوقِ سفر میں حدِّ سفر کیا

یہ کوہ و بیاباں یہ دشت و در کیا

منزل کو آخر اس کی خبر کیا

آزاد کی ہے حدِّ نظر کیا

اے عزمِ راسخ! اے جذبِ کامل

راہِ طلب ہیں خوف و خطر کیا

گرداب کیا ہے طوفان کیا ہے

ساحل کو آخر اس کی خبر کیا

نظر نے فاش کیا دل کا راز آخر کار

زباں خموش تھی لیکن فغاں خموش نہ تھی

وُہ مہر و مہ کی تجلّی میں کھو گئی آخر

نظر بلند ارادہ تھی سخت کوش نہ تھی

○

جو ہو سکے تو ہو نوائے شکستِ ساز بھی سُن

نوائے ساز نوائے شکستِ ساز نہیں

○

جنونِ شوق کے آگے خرد کی کچھ نہ چلی

وگرنہ میں تو کچھ ایسا خرد سے دُور نہ تھا

سب اپنے دِل کی تجلّی تھی جو نظر آئی

کمالِ شوق تھا سارا کمالِ طور نہ تھا

غرورِ عشق نے روکے رکھا مجھے ورنہ
مری جبیں سے ترا آستانہ دُور نہ تھا

○

عشق فریب دے گیا عقل فریب کھا گئی
آنکھ جھپک سکا نہ شوق ہوش کو نیند آگئی
کون سا راز پا کے یُوں اشک فشاں ہوا چمن
بادِ نسیم صبحدم باغ کو کیا بتا گئی

○

حضورِ شمع سے ناکام پروانے نہیں جاتے
کہ جب تک جاں نہیں جاتی یہ دیوانے نہیں جاتے
خدا جانے یہ کیا بجلی گری کیسی سموم آئی
کہ چہرے گلستاں زادوں کے پہچانے نہیں جاتے

بے چین و بے قرار و پریشاں ہے زندگی

اس پر بھی نغمہ ریز و غزل خواں ہے زندگی

○

بارہا آتا ہے آزاد شکستوں کا خیال

بارہا دل کے ارادوں پہ ہنسی آتی ہے

○

باغِ عالم میں یہ بے گانہ روی اے آزاد

کیا خبر ہے کہ وہ محبوب کہاں مل جائے

○

زندگانی کا یہ دریا ہے تو گرداب بہت

تو نے اے چشمِ تماشا ابھی دیکھا کیا ہے

یہ سہارے کی تمنّا میں بھٹکتی ہی رہیں

آرزو ہے کہ نگاہوں کو سہارا نہ ملے

○

بیزار ہے دُنیا سے دل ایسا کہ زباں پر

اب شکوۂ بے مہرئ دنیا نہیں آتا

طوفاں میں ہو ساحل کے سہارے کی تمنّا

اے عقل! جنوں کو یہ سلیقہ نہیں آتا

○

جو تو ہو دُور تو حاصل نہ ہو نظر کو قرار

جو تو ہو پاس تو بے تابئ نظر نہ رہے

یہ آرزو ہے کہ تیرا نشاں کہیں مل جائے

نہیں ہے غم اگر اپنی ہمیں خبر نہ رہے

تری تلاش کی وادی میں جانے والوں کو

عجب نہیں اگر اپنی بھی کچھ خبر نہ رہے

○

ممکن ہے کہ یہ طوفاں لے دل طوفاں ہو کسی کی رحمت کا

کیوں آج سفینے والے خود طوفاں کی تمنّا کرتے ہیں

○

ساز کے پردوں میں نغمہ اس طرح پوشیدہ ہو

ساز جس دن ٹوٹ بھی جائے صدا باقی رہے

○

ہنوز رشتہ بپایئہ طائرانِ چمن ؟

بگو نسیمِ سحر کز چمن بر دل آئی

مرا بس ہر ایک شجر پہ تھا مرا حق تھا ہر گُل و خار پہ

وہ زمانہ خواب ہُوا کہ جب مری دسترس تھی بہار پہ

○

کبھی مانوس دُنیا سے کبھی مایوس دُنیا سے

گزاری اس طرح آزاد نے عمرِ رواں اپنی

○

شبِ فراق کی تاثیر دیکھنے والے

اب اور بھولنے والے کا انتظار نہ کر

چمن میں آ مگر اس کی فضا سے دل نہ لگا

ٹھہر نہ صحنِ چمن میں گلوں سے پیار نہ کر

خزاں بھی صحنِ چمن میں نہیں قرار نصیب

خزاں کے دور میں اے دل غمِ بہار نہ کر

ندّی نالے منزل پا کر اپنی ہستی کھو بیٹھے

چاند ستارے گرمِ سفر ہیں ان کی منزل کوئی نہیں

حیراں ہو کر دیکھنے والے فکر و نظر سے کام نہ لے

عشق ہے وُہ ذخّار سمندر جس کا ساحل کوئی نہیں

غزل

اب یاد نہیں ہر صبح تری اب ذکر نہیں ہر شام ترا

اس پر بھی مگر آجاتا ہے اے دوست زباں پر نام ترا

اے نور کے ذرّے سامنے تو اک نور کا دریا بہتا ہے

اے صبح کے تارے تجھ کو بھی معلوم ہے کچھ انجام ترا

اُلفت میں سراپا درد بنا اب اور تمنّا کیا ہے تری

اے درد پہ مٹنے والے دل! اب درد ہے خود انعام ترا

اے جوشِ جنوں ادراک نے تو ہر گام پہ ٹھوکر کھائی ہے
گو اس نے سُنی آواز تری سمجھی نہ مگر پیغام ترا
آزاد کو جانے کیا سمجھے ہر پھول چمن میں بول اُٹھا
ہم چاک گریباں والوں کی محفل میں بھلا کیا کام ترا

○

کمزور جان کر بھی تجھے اے غمِ فراق
دِل نے لیا ہے تیرا سہارا کبھی کبھی

دائرے

دائرے بنتے چلے جاتے ہیں تاحدِّ نظر
اُجلے اُجلے دُھندلے دُھندلے مٹتے مٹتے دائرے
کون سے نقطے سے ہے آغاز ان کا کیا خبر
اور کہاں انجام ہے یہ بات بھی پوشیدہ ہے

دائرے ہیں یہ کہ زنجیریں تخیّل کے لئے
فکر کو پابند کرنے میں جو ہیں ناکامیاب
دائرے ہیں یہ کہ سیمیں جال ہیں پھیلے ہوئے
طائرِ ادراک جن سے اُڑ رہا ہے دُور دُور

دائرے — روشن کہیں دُھندلے کہیں اوجھل کہیں

جیسے ماضی کے دُھندلکوں میں نمایاں ہو کبھی

یاد اُن بھُولے ہُوئے بسرے ہوئے احباب کی

گردشِ دَورِ زماں نے آج پھینکا ہے جنھیں

دُور آنکھوں سے تمنّا کی رسائی سے پرے

دائرے تابندہ و رخشندہ و بے نور سے

ہاں یونہی بنتے چلے جاتے ہیں تا حدِّ نظر

دائرے اُلجھے ہُوئے باہم سمٹتے پھیلتے

تیز رفتار اِن میں کوئی اور کوئی سست رو

پھر بھی سب باہم رواں اندازِ ہم آہنگ سے

ابتدا اور انتہا کی قید سے آزاد ہیں
چشمِ بینا کو گماں ہوتا ہے ان کو دیکھ کر

دائرے جن کے تسلسل کا سرا نایاب ہے
بس یونہی بنتے چلے جاتے ہیں تا حدِّ نظر

دو شعر

عزمِ سفر! ذرا ابھی اور بھی تیز تیز چل
تیرا مقامِ ذوق و شوق دور بھی ہے بلند بھی

عقل کی انتہا ہے کیا عقل فقط گرہ کشا
عشق گرہ کشا بھی ہے اور گرہ پسند بھی

سکوت

وقت نے باغ میں چھیڑا ہے پھر افسانۂ حُسن

چاندنی رات، دلآویز فضا

زرد رُو کاہکشاں

پھُول — بشّاش وملول

چند خاموش سے کردار ہیں افسانے کے

یہ فسانہ کہ کسی قید کا پابند نہیں

یہ فسانہ کہ ازل سے ہے ابد تک جاری

چھا گیا آج کی رات

بن کے احساس دلِ شاعر پہ

جاذبیت کا وہ عالم ہے اس افسانے میں

کہ گماں ہوتا ہے

میں بھی اک جزو ہوں شاید اسی افسانے کا

○

بہار آئی ہے اور میری نگاہیں کانپ اُٹھی ہیں

یہی تیور تھے موسم کے جب اُجڑا تھا چمن اپنا

غزل

ممکن نہیں کہ بزمِ طرب پھر سجا سکوں

اب یہ بھی ہے بہت کہ تمہیں یاد آ سکوں

یہ کیا طلسم ہے کہ تری جلوہ گاہ سے

نزدیک آ سکوں نہ کہیں دُور جا سکوں

ذوقِ نگاہ اور بہاروں کے درمیاں

پردے گرے ہیں وُہ کہ نہ جن کو اُٹھا سکوں

تاروں کی گردشوں کا اڑاؤں مذاق میں

میں تم کو ایک بار جو واپس بلا سکوں

کس طرح کر سکو گے بہاروں کو مطمئن

اہلِ چمن جو میں بھی چمن میں نہ آ سکوں

اس بزم میں جہاں نہ علم ہے نہ ہے قتیل

میرا قصور کیا جو ترانے نہ گا سکوں

تیری حسیں فضا میں مرے اے نئے وطن

ایسا بھی ہے کوئی جسے اپنا بنا سکوں

آزاد! سازِ دل پہ ہیں رقصاں وہ زمزمے

خود سُن سکوں مگر نہ کسی کو سُنا سکوں

نیا دور۔ نئے رہزن

یہ کوئی خاص بڑی بات نہیں ہے اے دوست!

چور گلشن سے اگر پھول چرا لیتے ہیں

حادثہ ہے یہ مگر اس پہ تعجب تو نہیں

راہ زن قافلے والوں کو اڑا لیتے ہیں

اس نئے دور میں دیکھے ہیں وہ رہزن ہم نے
جو بہاروں کو گلستاں سے چرا لے جائیں
دیں نگاہوں کو جو دھوکا تو پتہ بھی نہ چلے
اور ضوِ انجمِ تاباں سے اڑا لے جائیں

اس طرح ان کی نظر پھول پہ ڈاکہ ڈالے
پھول موجود رہے پھول میں خوشبو نہ رہے
حرص کی آنکھ سے وہ تیری طرف دیکھ جو لیں
ترا پیکر ہے موجود مگر تو نہ رہے

قعرِ دریا میں اُتر جائیں تو انجام یہ ہو

قعرِ دریا میں صدف تو رہے گوہر نہ رہے

اور مائل جو ترے ذہن پہ ہو اُن کا دماغ

ذہن میں تیرے عرَض تو رہے جوہر نہ رہے

کسی ماحول کے پابند نہیں ہیں یہ لوگ

ایسے لوگوں کی ہے ہر گوشۂ عالم میں نمود

بزم میں دیکھنا چاہے تو وہاں مل جائیں

رزم میں ڈھونڈنا چاہے تو وہاں بھی موجود

اس نئے دور میں کہنا ہے یہی تجھ سے مجھے
کہ ترا ہوش لٹے راہزنوں سے محتاط
تیری محنت جو ترے حق میں ہے سامانِ الم
ہو کہیں اور نہ وہ خالقِ سامانِ نشاط

⊙

زندگی پاس ہے مجھ کو تری مجبوری کا
ورنہ اظہارِ غمِ دل کوئی مشکل تو نہیں

پناہ گزیں

خموشیوں میں حادثوں کی داستاں لئے ہوئے
دلِ حزیں میں درد و غم کا اک جہاں لئے ہوئے
نگاہ میں حدیثِ جورِ دوستاں لئے ہوئے

رواں ہے ایک قافلہ

مکاں کسی کا جل گیا کسی کا گھر اُجڑ گیا

کسی سے کوئی زندگی کا آسرا بچھڑ گیا

لُٹی ہوئی بُجھی ہوئی جوانیاں لئے ہُوئے

رواں ہے ایک قافلہ

اگرچہ دُور آ چکے دھڑک رہے ہیں دل ابھی

قدم میں کپکپی سی ہے نظر ہے مضمحل ابھی

خموش لب پہ حشرِ نالہ و فغاں لئے ہُوئے

رواں ہے ایک قافلہ

بُجھی بُجھی نگاہ میں اُمید بھی ہے یاس بھی

نظر میں حوصلے بھی ہیں محیط ہے ہراس بھی

غرض عجیب رنگ کی کہانیاں لئے ہُوئے

رواں ہے ایک قافلہ

بیانِ نطق میں زبانِ شعر میں نہ آ سکے
جسے فقط نگاہِ غم نصیب ہی سُنا سکے
تباہیوں کی وہ مہیب داستاں لئے ہُوئے
رواں ہے ایک قافلہ

رُباعی

ماضی کی یادِ غم بڑھاتی ہی رہی
سوئے ہوئے ارمان جگاتی ہی رہی
مرطوب فضا میں سانس گھُٹتا ہی رہا
خوشبو بدنِ دوست سے آتی ہی رہی

غزل

کہوں کیا کہ عشق کیا ہے عجب اس کا ہے فسانہ

کبھی زیست کا سہارا، کبھی موت کا بہانہ

ترے آستاں کو چھوڑا تو ملا نہ پھر ٹھکانہ

وہی کاوشِ مسلسل، وہی گردشِ زمانہ

کبھی گلستاں کو جانچا، کبھی کہکشاں کو پرکھا

مرے ذوقِ جستجو کو نہ ملا کوئی ٹھکانہ

یہ چمن بھی کیا چمن ہے نہیں ہمصفیر کوئی

میں سناؤں بھی تو کس کو یہ نوائے عاشقانہ

تجھے کیا بتاؤں ہمدم! کہ قفس میں کیا کشش تھی

یہ بجا مری نظر سے نہ پرے تھا آشیانہ

یہ بجھی بجھی فضائیں یہ گھٹا گھٹا سا عالم

مرے منطق! چھیڑ کوئی طرب آفریں ترانہ

نہ الم ہے دوش کا کچھ، نہ کچھ اشتیاقِ فردا

یہ جو آج سامنے ہے یہی ہے مرا زمانہ

شاعر

تجھ کو قدرت نے اگر بخشا ہے قلبِ دردمند

تو اگر شاعر ہے اور تجھ کو صداقت ہے پسند

تو ذرا تھم اور توجہ سے مری آواز سن

ہاں مری آواز یعنی وقت کی آواز سن

خطۂ کشمیر میں جو کچھ ہوا اُس کو نہ دیکھ

صبح کی تنویر میں جو کچھ ہوا اس کو نہ دیکھ

سرزمینِ کشورِ پنجاب کے نالے نہ سُن

عقل کے شیون دلِ بے تاب کے نالے نہ سُن

کان تو ہرگز نہ دے بیواؤں کی فریاد پر

اور یتیموں کی فغاں سے بے نیازانہ گزر

بھول کر بھی تو نہ ڈال ارضِ فلسطیں پر نگاہ

تاکہ سہواً بھی ترے دل سے نہ نکلے ایک آہ

سامنے گر چین کا نقشہ بھی ہو پروا نہ کر

ہندِ چینی کے مقدّر کا خیال اصلا نہ کر

وقت لے آئے جو تیرے سامنے تصویرِ دہر

صاف کہہ دے کام شاعر کا نہیں تعمیرِ دہر

قتل و خوں یونان کا، ایران کا یہ پیچ و تاب

جنگِ برما، خاکِ انڈونیشیا کا اضطراب

یہ تماشے دیکھتا جا اور منہ سے کچھ نہ کہہ

سینۂ گیتی دھڑکتا دیکھ اور خاموش رہ

اور اگر کہنا ہو کچھ اپنے وطن کی شان میں

راز کی اک بات میں کہتا ہوں تیرے کان میں

یہ نہ کہہ انگریز بد باطن کا ہے سارا قصور

بلکہ ہندو ہے تو کہہ یہ ہے مسلماں کا قصور

اور سمجھتا ہے تو اپنے آپ کو مسلم اگر

تو مناسب ہے کہ سب الزام دے ہندو کے سر

دیکھ اپنے آپ کو شہری نہ دنیا کا سمجھ

قوم کی زنجیر میں جکڑا ہوا بندہ سمجھ

بس سخن گوئی کا یہ معیار یہ پیمانہ ہے

تو اگر قائل نہیں اس کا تو پھر دیوانہ ہے

ہاں اسی معیار سے عالم کے ہر پہلو کو ناپ

زندگانی کی خوشی اور غم کے ہر پہلو کو ناپ

اس سے تیرا قوم میں اونچا نشاں ہو جائے گا

کامراں فن ہو نہ ہو تو کامراں ہو جائے گا

۱۹۴۸ء

غزل

نہ پہنچیں گی نگاہیں ماورائے آسماں کب تک

رہے گا راہ میں حائل غبارِ کہکشاں کب تک

وطن کہتے تھے جس کو چھٹ گیا اب دیکھنا یہ ہے

کہ رہتے ہیں دیارِ غیر میں ہم میہماں کب تک

قفس کی دلکشی میں تو کمی کوئی نہیں لیکن

نہ آئے گی قفس میں رہ کے یادِ آشیاں کب تک

ذرا اتنا تو فرما دے کہ منزل کی تمنّا میں

بھٹکتے ہم پھریں گے اے امیرِ کارواں کب تک

زباں بن کر شہیدوں کا لہو اک دن پکارے گا

رہے گی شاخِ آہو پر براتِ عاشقاں کب تک

خزاں آئی گلستاں میں تو ہم سمجھے بہار آئی

نگاہِ شوق آخر یہ تری خوش فہمیاں کب تک

زباں سے آگ برسانا پڑے گی اس گلستاں میں

یہاں اے ہم نفس پابندئ رسمِ فغاں کب تک

بہ ذوق و شوق بحرِ عشق میں اے کودنے والے!

یہ عالم ہے تو پھر اندیشۂ سود و زیاں کب تک

ذرا سوچو تو اے منزل کا رستہ بھولنے والو!

بالآخر آزماؤ گے جفائے دشمناں کب تک

یہ اپنی منزلِ مقصود پر کب تک نہ پہنچے گا
فریبِ رنگ و بُو کھائے گا آخر کارواں کب تک

بشر کو بھی کبھی تو موردِ الزام ٹھہرا دے
یہ ناداں شکوۂ جور و جفائے آسماں کب تک

تعجّب ہے پتہ خود باغبانوں کو نہیں اس کا
رہے گا اس طرح برہم مزاجِ بوستاں کب تک

اسیرانِ طلسمِ وہم سے آزاد یہ کہہ دو
یہ رنگ و نور و نکہت کا ہجومِ بیکراں کب تک

آزاد و اقبال

آزاد

ذلیل و خوار ہیں اہلِ ہُنر کیوں
جہاں ناقدرداں ہے اس قدر کیوں
جو کوسوں دور ہیں علم و ہُنر سے
وُہی ہیں صاحبِ لعل و گہر کیوں

اقبال

قماش و نقرہ و لعل و گہر چیست

غلامِ خوش رگل و زرّیں کمر چیست

چو یزداں از دو گیتی بے نیاز ند

دگر سرمایۂ اہلِ ہنر چیست

آزاد

علومِ عصرِ نو دیوانہ ام کرد

زِ شوقِ زندگی بے گانہ ام کرد

فغاں از شعبدہ بازیٔ افرنگ

حقیقت بودم و افسانہ ام کرد

اقبال

خودی را نشئۂ من عین ہوش است

ازاں پیمانۂ من کم خروش است

مئے من گرچہ ناصاف است درکش

کہ ایں تہ جرعۂ خم ہائے دوش است

غزل

اب دور ترے فہم سے ہے میری کہانی

ہر لفظ نے تبدیل کئے اپنے معانی

افکار سے انساں کو بقا بھی ہے فنا بھی

فانی ہیں جو افکار ترے تو بھی ہے فانی

"تا حدِ نظر اب ہے اندھیرا ہی اندھیرا"

یہ ذوق ہے مٹتی ہوئی دنیا کی نشانی

اے ارضِ جہاں کس کی ضرورت ہے تجھے اب

آنسو کا یہ پانی ہے یہ تلوار کا پانی

بہبودِ بشر کے یہ اگر کام نہ آئی

کس کام کی اے ذوقِ سخن تیری جوانی

اے شاعرِ امروز کر انساں سے تخاطب

افلاک پہ اب فاش نہ کر رازِ نہانی

جس نظم میں موجود نہ فردا کی تڑپ ہو

وہ نظم ہے آزاد فقط مرثیہ خوانی

اُردو

پہلی بار — مارچ ۱۹۵۱ء

دوسری بار — دسمبر ۱۹۵۲ء

تیسری بار — جولائی ۱۹۵۴ء

پرنٹر:- محبوب المطابع برقی پریس دہلی

پبلشر:- مکتبۂ شاہراہ اردو بازار دہلی

اُردُو

جو آزاد نے ۱۹ ستمبر ۱۹۵۰ء کو اردو مجلس دہلی

کی پہلی سالگرہ کی تقریب پر جب کہ تقسیمِ ہند کے

بعد پہلی بار دہلی میں انجمن ترقّی اُردو (ہند) کی شاخ قائم

ہوئی خواجہ حسن نظامی کی زیرِ صدارت ڈیویکوز ہال میں پڑھی۔

اِس حقیقت کے نام

کہ اردو ہندوستان کی ایک ترقّی یافتہ

اور ترقی پسند زبان ہے اور ہندوستانی

تہذیب و تمدّن کا باغ اِس پھُول کے بغیر

کبھی طرح مکمل نہیں سمجھا جا سکتا

پیش نامہ

صرف یہ کہنا بالکل کافی نہیں کہ جگن ناتھ آزاد کی یہ نظم بہت اچھی ہے۔ میں حال ہی میں آزاد کی شاعری سے آشنا ہوا ہوں۔ گذشتہ اگست میں میں نے اُن کے کلام کے مجموعہ "بیکراں" پر "ہماری زبان" میں مختصراً اپنے اِن تاثرات کا اظہار کیا تھا۔ کہ "آزاد، ہندستان کے اس دوسرے جنم کے نقیب ہیں لیکن وہ اس کے قایل نہیں کہ "ایک ہی قدم میرے لئے بس ہے۔" وہ آزاد ہندستان کی آزادی سے بھی کچھ آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔" میرا مطلب یہ تھا کہ ہماری آزادی کی تکمیل ——— ذہنی، سماجی اور اخلاقی ——— ابھی باقی ہے اور اس تکمیل کے لئے "ہماری نئی دنیا کے نئے ادب اور شعر کے نئے پیغمبروں اور نئے اوتاروں کی ضرورت ہے۔" آزاد کے کلام کا اس قدر گہرا اثر میرے دل پر اس لئے پڑا ہے کہ وہ ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فتنہ کی آگ میں گذر کر اور آوارۂ وطن ہو کر ہندستان آئے اور پھر بھی اونی تعصّبات کی اُس گندگی سے انہوں نے اپنا دامن بچا لیا جس سے آج بہت سے دامن آلودہ ہیں۔ یہ شخصی کردار کا ایک بہت بلند مقام ہے!! ایک ایسے شاعر کی آواز کو محض شاعرانہ سخن آرائی تو نہیں کہہ سکتے! وہ تو غیب کی آواز ہے، وہ تو زندگی کی

ایک نوید ہے!

یہ نظم جواب شائع ہوتی ہے اُردو زبان کے متعلق آزاد کی بلند نظری کا ایک نقش ہے، جس کی تعریف میں اس لئے نہیں کرتا کہ میری مادری زبان اُردو ہے یا میں انجمنِ ترقّیِ اُردو کا سکریٹری ہوں بلکہ اس لئے کرتا ہوں کہ یہ نظم اُردو زبان کے ارتقاء کی تاریخ کا ایک جُزو ہے اور اس میں ہمیں اس حقیقت کا چہرہ نظر آتا ہے کہ اُردو ہمارے ملک کی مشترکہ زبان تھی اور ہے۔ اس کے چہرے کو آج ہمارے ملک کے بہت سے لوگ دیکھنا پسند نہیں کرتے، لیکن تاریخ اور زندگی کی حقیقتوں سے آنکھ بند کر کے انکار کر دینا اُن کو باطل نہیں کر سکتا! تاریخ کے گواہ تصنّع پسند اور سخن ساز سیاست کی سخت ترین ضربیں کھا کر بھی زندہ رہا کرتے ہیں۔

آزاد کی ذہنی زندگی روشن اور تاباں ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ ایسی ہی رہے گی، گرد و غبار سے پاک! اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اُن کے چراغ سے ہزاروں چراغ ہمارے عزیز وطن میں روشن ہوں گے اور ایک دن آئے گا کہ اس ملک میں شاعروں کی شاعری اور ادیبوں کا ادب عوام کی زندگی کا اس طرح آئینہ دار ہو گا کہ پھر عکس کو آئینہ سے جُدا نہ کیا جا سکے گا۔

علی گڈھ
۳۰ دسمبر ۱۹۵۸ء

(قاضی) محمّد عبد الغفار

طبع ثانی

اس نظم کا دوسرا ایڈیشن میں کسی قدر اضافے کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ اکثر شعراء اور ادبا
کے نام جو اصل نظم میں موجود نہیں تھے اب بڑھائے گئے ہیں۔ آخر میں ایک تعارف نامہ بھی شامل کر دیا
گیا ہے تاکہ جس شاعر اور ادیب کا ذکر نظم میں آیا ہے اُس کے ادبی کارناموں سے بھی پڑھنے والے کو واقفیت ہو سکے۔

دو باتوں کی جانب یہاں میں خاص طور پر ناظرین کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ فن کاروں
کے ناموں کے ذکر میں کسی تاریخی ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا۔ جیسے جیسے فن کاروں کے نام خیال میں
آتے گئے وہ نظم میں شامل ہوتے گئے۔ تاریخِ ادب کی کسی کتاب کو سامنے رکھ کر شعر کہنا میرے بس
میں نہ تھا۔ اسی لئے ممکن ہے بعض اہم نام اس نظم میں شامل ہونے سے رہ گئے ہوں۔

دوسری بات ان فن کاروں کی کتابوں کے متعلق ہے۔ کوشش میں نے یہ کی ہے کہ ان مصنفوں
کی تمام کتابوں کا ذکر آجائے لیکن چونکہ یہ فہرست بھی میں نے اپنی یادداشت سے مرتّب کی ہے، لہٰذا اس
کے مکمل ہونے کے متعلق بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے بعض اہم کتابیں درج ہونے سے رہ گئی ہوں
لیکن چونکہ نظم پیش کرنے کا مقصد مصنفوں یا کتابوں کے نام گنوانا نہیں ہے بلکہ اس حقیقت
کو پیش کرنا ہے کہ اُردو کسی ایک طبقے کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ سارے ملک کی زبان ہے اور اس
کی پرورش میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے حصّہ لیا ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ناموں
کی کمی بیشی مقصد کی صداقت پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

آزاد

دہلی - ۲۴ جنوری ۱۹۵۲ء

طبع سوم

اس ایڈیشن میں تعارف نامہ حذف کر دیا گیا ہے

دہلی
یکم فروری ۱۹۵۱ء

آزاد

تمہید

غالباً یہ ۱۹۴۴ء کا واقعہ ہے۔ انجمن ترقیِ اردو لائل پور نے علّامہ برج موہن کیفی کے اعزاز میں ایک ادبی جلسہ منعقد کیا تھا اور مجھے لاہور سے اس جلسے میں شرکت کی دعوت دی تھی میں بالعموم مخصوص تقریبوں میں اپنی عام ادبی چیزیں پڑھ دیا کرتا ہوں۔ لیکن اس تقریب کے لئے میں نے خاص طور پر ایک نظم کہی۔ بدقسمتی سے میں جس وقت لائل پور پہنچا تقریب ختم ہو چکی تھی اور میرے میزبان تقریب میں شرکت کے بعد گھر واپس آ چکے تھے۔ مجھے اس محفل میں شریک نہ ہونے کا افسوس ہوا اور نظم کاغذات ہی میں دھری رہ گئی۔

۱۹۴۷ء میں میں لاہور سے چلا تو اس بے ترتیبی سے کاغذ جمع کئے کہ اکثر کام کی چیزیں کتابیں، مسوّدے وغیرہ وہیں رہ گئے اور ردّی کاغذات کے پلندے جلدی میں جمع کی ہوئی چیزوں کے ساتھ یہاں دلّی آ گئے۔ چند ماہ ہوئے یہ کاغذات دیکھ رہا تھا کہ ان میں سے یہ نظم برآمد ہوئی اور اس خیال کے پیشِ نظر کہ نئے حالات میں اس کی اہمیت شاید کم نہیں ہوئی بلکہ پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ اسے موجودہ صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ تمہید اس لئے لکھی ہے کہ پڑھنے والے اس نظم کو تازہ نہ سمجھیں، کیونکہ اردو

سے جو توقعات اس نظم میں وابستہ کی گئی ہیں اُن میں سے اکثر پُوری نہیں ہوئیں، ہاں جن جذبات کا میں نے اظہار کیا ہے وہ آج بھی میرے ہیں اور تقسیمِ ہند اور اس سے پیدا ہونے والے واقعات اُنھیں مجھ سے چھیننے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

دہلی
دسمبر ۴۷ء

آزاد

اُردو

سُنا ہے ہند پہ یُوں حکمراں تھی آلِ تیموری

کہ مُلک اک جسم تھا اور اُس میں جاں تھی آلِ تیموری

یہ تھا دَور آدمیّت کا، شرافت کا، مروّت کا

وطن میں یہ زمانہ تھا، زمانہ امن وراحت کا

ہُوئیں شیر و شکر اس طرح دو اقوام آپس میں

کہ پھیلیں ہر طرف ہندُستاں میں پیار کی رسمیں

اکھٹّے ہندو و مسلم شریکِ حکمرانی تھے

وطن کے پاسباں مل جل کے محوِ پاسبانی تھے

اِدھر بھی اک تمدّن تھا اُدھر بھی اک تمدّن تھا

نظر آیا وطن کی سرزمیں پر اک حسیں نقشہ

نہ کیوں اُس گلستاں میں ارتقاء کے پھُول پیدا ہوں

جہاں پہلو بہ پہلو دو تمدّن کارفرما ہوں

جہانِ علم پر چمکے مثالِ کہکشاں ہندی

حکومت کی زباں تھی فارسی اپنی زباں ہندی

عنادل نغمہ آرا تھے ادب کے گلستانوں میں

اضافہ ہو رہا تھا اس طرح دونوں زبانوں میں

مگر اس میں قباحت کا بھی اک پہلو نظر آیا

عمل کی زندگی میں جو مسلسل مشکلیں لایا

ملے ہندوستانی سے جو باہم ترک و ایرانی

تو مشکل ہو گئی اک دوسرے کو بات سمجھانی

بہت مشکل نظر آیا یہ باہم ربط کا عالم

"زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم"

خلوصِ قلب سے لیکن یہ مشکل حل ہوئی آخر

نئی اک گفتگو کی طرز دونوں کو ملی آخر

وہ طرزِ گفتگو آزاد! کچھ ایسی حسیں نکلی

کہ اِن دونوں زبانوں سے زیادہ دل نشیں نکلی

کیا "اُردو" بالآخر وقت نے تجویز نام اس کا

مروّت اس کا شیوہ تھا جہانگیری تھا کام اس کا

یہ عقدہ حل کیا جس نے وہ دَورِ شہجہانی تھا

یہ دَورِ شہجہانی تھا کہ لطفِ آسمانی تھا

ہمارے دیس کے اُجڑے گلستاں میں بہار آئی

ہوئی اک طرزِ نَو پر اس وطن میں محفل آرائی

مگر دَورِ فلک کو یہ طریقہ ناپسند آیا

محبّت کا، مروّت کا سلیقہ ناپسند آیا

حقیقت ہو گئی پنہاں فسانے ہو گئے پیدا

لڑائی اور جھگڑے کے بہانے ہو گئے پیدا

نتیجہ یہ ہوا افسانہ بن کر رہ گئی اُلفت

بس اک ٹوٹا ہوا پیمانہ بن کر رہ گئی اُلفت

ہوائے وقت نے تاریخ کا جس دم ورق اُلٹا

تو یاروں کی زبانوں پر نظر آیا سبق اُلٹا

نگاہوں میں محبّت کی جگہ نفرت نظر آئی

تجلّی گم ہوئی چاروں طرف ظلمت نظر آئی

ہوئے نصرت نصیب اس طرح سے آفت کے پرکالے

محبّت کھیل ہاری اور جیتے دشمنی والے

یہی وہ دورِ نو ہے جس میں ہم اب سانس لیتے ہیں

اسی کیچڑ کی ندی میں ہم اپنی ناؤ کھیتے ہیں

یہی وہ دور ہے رستے میں جو اب ہم نے پایا ہے

کسی سے کیا کہیں کیا ہم نے پایا کیا گنوایا ہے

یہی وہ دور ہے جس پر تمدن ناز کرتا ہے

اسی کا لمحہ لمحہ عرش تک پرواز کرتا ہے

یہی وہ دور ہے جس کو بڑی جدت کا دعویٰ ہے

بڑی حدت کا دعویٰ ہے بڑی ندرت کا دعویٰ ہے

نہ اب وہ پیار کی باتیں نہ وہ اخلاص باقی ہے

نہ اب وہ پینے والے ہیں نہ وہ مے ہے نہ ساقی ہے

صفا و صدق جو مفقود ہیں آج اپنے سینوں سے

کبھی وہ دن بھی تھے ظاہر تھے جب اپنی جبینوں سے

مگر اک چیز بچھڑے دل کو ملا سکتی ہے جو اب بھی

ہمارے ملک کی بگڑی بنا سکتی ہے جو اب بھی

ملا سکتی ہے جو، وہ صدق کی زنجیر باقی ہے

جو دیکھیں غور سے اے دوستو! وہ تعمیر باقی ہے

بنا رکھی گئی تھی جس کی دَورِ شہجہانی میں

مگر افسوس اب یورش ہے جس پر بدگمانی میں

یہ وُہ شے ہے جو لائے ایک مرکز پر حریفوں کو

مئے کہنہ پلائے ایک مرکز پہ حریفوں کو

غلط ہے جو سمجھتا ہے اسے اغیار کی بولی

یہ ہے اخلاص کی طرزِ تکلّم پیار کی بولی

ذرا اے معترض! اک لمحہ کی زحمت گوارا کر

مرے ہمراہ آ اور بزمِ اُردو کا نظارا کر

یہ وہ محفل ہے جس میں برق قیکسبت و سرور آئے

کہ جن کے شعر پڑھ کر فکرِ انسانی میں نور آئے

یہ وہ محفل ہے زینت جس کی ہے سرشار کے دم سے

نسیمِ خوش بیاں کی طبعِ گوہر بار کے دم سے

جمالستان کا محرم فراق اس میں نظر آئے

یہ وہ محفل ہے تفتہ سا سخنور جس کو اپنائے

مرے والد سا بھی فن کار اس محفل میں شامل ہے

وفا ایسا فسوں گفتار اِس محفل میں شامل ہے

ہری چندا اختر اِس میں عرش اِس میں جوش ہے اِس میں

شرابِ علم و فن کا آج ہر مدہوش ہے اِس میں

ہے افسانہ طرازِ بزمِ گیتی بیریم چند اِس میں

پر افشاں ہیں نظر کے نغمہ ہائے درد مند اِس میں

منوّر جلوہ گہ اِس میں نظر شعلہ طراز اِس میں

اُفق کے دل سے اُٹھے نالہ ہائے جانگداز اِس میں

گہر کی آب اِس میں مہر کی تابندگی اِس میں

عیاں ہے امن کے اشعار کی خرشندگی اِس میں

نجم نے اور جواہر سنگھ نے اس کو سنوارا ہے

کشن پرشاد سا فن کار اسی گردوں کا تارا ہے

بلندی اوج کے افکار کی ہے جلوہ گر اس میں

یہیں اعجاز معجز ہے وفا کا ہے اثر اس میں

اسی محفل میں دیکھی اہلِ دل نے دل کی بیتابی

نظر آئی اسی میں گلشنِ مخلص کی شادابی

تسلّی کی نوا اس میں رواں روحِ رواں اس میں

مدن کی اور ساحر کی بلندی کا نشاں اس میں

اسی میں کیفِ دیوانہ اسی میں جذبِ پروانہ

اسی محفل کا لکھا صدرؔ نے جوہرؔ نے افسانہ

ہُوا بنوارئ آتش بیاں شعلہ طراز اس میں

سُنائے برہمن نے نغمہ ہائے دل نواز اس میں

یہاں موجود ہے بیدی، اوپیندر ناتھ ہے اس میں

کنہیا لال ہے اس میں مہندر ناتھ ہے اس میں

کوشلیا، ساگر اور بلونت سے ہیں پختہ کار اس میں

ہُوئے ہیں کرشن سی ہستی کے جوہر آشکار اس میں

مجھے بھی دیکھ میں بھی نغمہ خواں اس انجمن میں ہوں

(مجھے بھی ہے یقیں اس بات کا اپنے چمن میں ہوں)

یہاں ستیارتھی بھی، ریوتی بھی اور سعد بھی ہے

یہ محفل اپنی منزل بھی ہے اپنی رہگزر بھی ہے

یہاں مخمور بھی ہے شاد بھی ہے اور متّل بھی

یہاں ہے تاجور بھی فکر بھی مضطر بھی دُگل بھی

اسی محفل میں مُلّا کے سکوں پرور ترانے ہیں

اسی میں ضوفگن پرکاش پنڈت کے فسانے ہیں

فسانے اس میں راہبر کے مضامیں اس میں شیدائے

ہر اک جانب ہیں رقصاں ولولے شوقِ تمنّا کے

یہ وہ محفل ہے جس کا صدرِ محفل آج ہے کیفی

ہمارے ملک کے شعر و ادب کا تاج ہے کیفی

وہ کیفی ناز فرماتا ہے آج اردو ادب جس پر

علمبردارِ حکمت کاروانِ فکر کا رہبر

اسی کے دم سے دیکھ آج اس بھری محفل کا نظارا

یہی ہے آسمانِ علم کا روشن ترین تارا

کیفی

سلام اے محسنِ اردو! سلام اے حامئ اردو

بدل ڈالی ہے تو نے حُسن میں ہر خامئ اُردو

اسے تو نے کچھ اس انداز سے سانچے میں ڈھالا ہے

کہ اب چاروں طرف اُردو زباں کا بول بالا ہے

بجا ہے گر تجھے معمارِ تعمیرِ ادب کہیئے

تجھے فخرِ زبانِ ہند، توقیرِ ادب کہیئے

سلام اے حامیٔ اُردو! سلام اے محسنِ اُردو!

ترا ہر نقش ہے نقشِ دوام اے محسنِ اُردو!

تری تقریر پر اُردو زباں خود ناز کرتی ہے

تری تحریر پر طرزِ بیاں خود ناز کرتی ہے

اسی کے فیض سے اسی فخرِ ادب کی ہے زباں اُردو

عداوت کی فضا میں ہے محبّت کا بیاں اردو

اسے اہلِ وطن دیکھیں نہ ہرگز بدگمانی سے

کہ دُھل کر آئی ہے یہ زمزم و گنگا کے پانی سے

ریاضِ دہر میں اُردو وہ اک خوش رنگ پودا ہے

جسے خونِ جگر سے ہندو و مسلم نے سینچا ہے

مرے اہلِ وطن یہ آدمیّت کا تقاضا ہے

محبّت کا، حمیّت کا، شرافت کا تقاضا ہے

کہ ہم پامالِ جورِ آسماں ہونے نہ دیں اس کو

خزاں کے دور میں وقفِ خزاں ہونے نہ دیں اس کو

وطن بھی ایک ہے اپنا زباں بھی ایک ہو اپنی

چمن جب ایک ہے طرزِ بیاں بھی ایک ہو اپنی